یه کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم هیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے هیں.

منجانب.



سبیلِ سکینه

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

یا عباسؑ

۷۸۶
۹۲_۱۱۰
یا صاحب الزّماں ادرکنیؑ

DvD Version

www.ziaraat.com

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

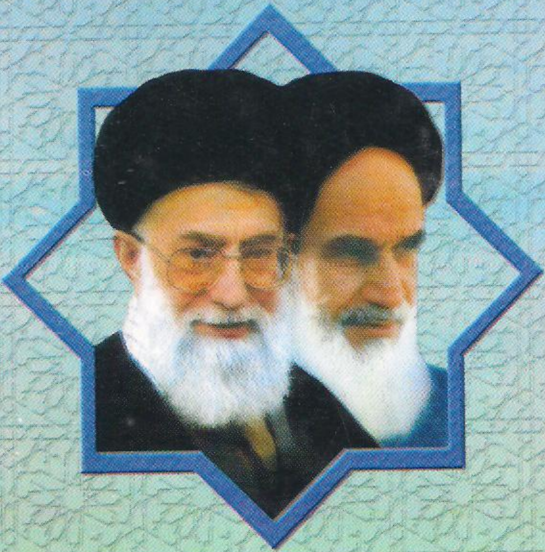
ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

NOT FOR COMMERCIAL

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

اضافہ شدہ ایڈیشن

ولایتِ فقیہ



حجۃ الاسلام محمد حسن صلاح الدین

حبلِ سکینہ

حیدرآباد لطیف آباد یونٹ نمبر ۸-۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولایتِ فقیہ

حجۃ الاسلام محمد حسن صلاح الدین

یکے از منشورات

مرکز اسلامی ٹرسٹ کراچی پاکستان

ضابطہ

نام : ولایتِ فقیہ

تألیف : حجۃ الاسلام محمد حسن صلاح الدین

کمپوزنگ : سکندر علی بہشتی، نادم شگری

ناشر : مرکز اسلامی ٹرسٹ کراچی

طبع اول : ذی القعدہ ۱۴۰۶ھ۔ جولائی ۱۹۸۶ء

طبع دوم : ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ۔ مئی ۲۰۰۶ء

طبع سوم : جمادی الاول ۱۴۲۹ھ۔ مئی ۲۰۰۸ء

قیمت : 150 روپے

ملنے کا پتہ

جامعة العلوم الاسلامیه

بی ۱۰۔ ۱۱ سروے ۶۳۹ جعفر طیار سوسائٹی ملیر کراچی

انتساب

- ان کے نام جنہوں نے نظریہ ''ولایتِ فقیہ'' کو سمجھا، اس کے تقدس کا دفاع کیا اور دفاع کرتے ہیں۔
- ان کے نام جو اس نظریے سے نا آشنا تو ہیں لیکن اسے سمجھنے کی کوشش میں مصروفِ عمل ہیں۔
- ان کے نام جنہوں نے صرف اسے سمجھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میدانِ عمل میں کود پڑے، اسلامی نظام کو ''ولایت فقیہ'' کے زاویہ نگاہ سے اسلامی معاشرے میں نافذ کیا۔
- ان افراد کے نام جو مکمل نظامِ خدا کو ساری زمین خدا پر، پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر پھیلانے اور تشہیر کرنے میں دن رات رواں دواں ہیں۔
- ان مجاہدین کے نام جو اپنی جانوں کو اسلام کی خاطر وقف کئے ہوئے ہیں اور اس کا نذرانہ بھی پیش کررہے ہیں۔

مولف

ترتیب

عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ نے رحمت دوعالم حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کو ایک کامل دین، روشن کتاب اور سرمدی شریعت کا حامل بنا کر کھلی گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دینے کی خاطر مبعوث فرمایا۔ رسالتمآب ؐ نے انسانیت کے لئے اسلام کا ایسا نظام پیش کیا کہ قلیل عرصے میں جہاں آپ ؐ کا پیغام پہنچا وہاں اسلامی نظام کو ہدایت ابدی کی خاطر مشعل راہ بنایا گیا، دنیا امن و آشتی کا نمونہ بن گئی اور ہر کوئی اس بابرکت نظام کے زیر سایہ سکون کی سانس لینے لگا۔

جوں ہی نبوت و رسالت کا سورج ڈوب گیا زمانے کے مزاج میں بھی تبدیلی آ گئی تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں نے پیغمبر اکرم ؐ کی تعلیمات سے روگردانی شروع کی، شریعت اسلامی کو اپنے اپنے مزاج اور اپنی اپنی خواہشات نفسانی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر پس پشت ڈال دیا اور اسلامی نظام سے منحرف ہو گئے جس کے نتیجے میں قومیت، علاقائیت، اشتراکیت، لادینیت اور دیگر نظام وجود میں آ گئے، جنہوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کا نعرہ بلند کیا، روٹی، کپڑا اور مکان کا جالب نعرہ ہر شخص کو اپنی طرف کھینچ لے گیا لیکن اسلامی نظام کے مقابلے میں یہ تحریکیں انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار نہ کر سکیں بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ تحریکیں اپنے حامیوں کو اخلاقی بے راہ روی، بدبختی، سیاہ کاری اور تباہی کے دہانے پر لے گئیں۔ اور یہ بجائے نجات دینے کے خود انسانوں کے لئے عذاب بن گئیں۔

اس کے برخلاف اسلام کا نظام اپنی آفاقیت، مزاج کی وسعت اور فطرت انسانی کے

ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے دوسرے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔

عصر حاضر کے عظیم انقلاب اسلامی (ایران) نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کا نظام آج بھی اپنی آب وتاب کے ساتھ قابل نفاذ ہے، بحمد للہ اس عظیم انقلاب بابرکت کے واسطے سے دنیا بھر کے مسلمانوں حتیٰ کہ غیر مسلموں میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اور مسلمان اس وقت ایک بار پھر دنیا میں نظام اسلامی کا نفاذ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسلامی نظام میں جس پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ نظام قیادت ورہبری یا دوسرے لفظوں میں ''ولایتِ فقیہ'' ہے۔ لیکن اسلام میں مختلف مکاتب فکر کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اسلام مخالف عناصر نے اس نظریئے کو فقط شیعہ مسلمانوں سے مختص متعارف کرایا ہے اور دیگر مکاتب کے اندر اس طرز حکومت سے اجنبیت کی فکر اور شکوک وشبہات کو عام کیا ہے، لہٰذا دیگر مسلمان اس نظریئے کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔

حجۃ الاسلام شیخ محمد حسن صلاح الدین صاحب کو خدا نے علم وتقویٰ کے ساتھ بصیرت فکری وسیاسی سے نوازا ہے۔ آپ مسلمانوں کی مشکلات کا واحد حل اتفاق واتحاد بین المسلمین اور نظام اسلامی کے نفاذ کو سمجھتے ہیں، لہٰذا آپ نے پاکستان کی سرزمین پر پہلی بار اس اہم ترین موضوع پر قلم اٹھایا۔ زیر نظر کتاب میں آیات، روایات، عقل اور شیعہ وسنی دونوں مکاتب فکر کے جید علماء وفقہاء کے نظریات سے استدلال کر کے ثابت کر دیا ہے کہ ''ولایتِ فقیہ'' تمام مسلمانوں کا متفق علیہ نظریہ ہے۔

آپ کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۵ء میں چھپ کر نایاب ہو چکی تھی۔ دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کے تھوڑے ہی عرصے میں ختم ہو گیا۔ اب یہ مزید کچھ ابواب کے اضافے اور پہلے سے زیادہ مواد کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ پیشکش بارگاہ ایزدی میں شرفِ قبولیت پائے۔

مرکزِ اسلامی ٹرسٹ

مقدمہ (طبع اول و دوم)

دور حاضر میں جب پوری انسانیت بے راہ روی، کج فکری اور ظلم وفساد کے سمندر میں غوطہ زن تھی اور ہر جانب سے ہر قسم کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور اس کی کشتی نجات مغربی، مشرقی اور خود مسلمانوں کی خودساختہ تہذیب وتمدّن اور فکری تضاد کے حامل بحرِ بیکراں میں ڈوب رہی تھی، ایک مرتبہ پھر دریائے رحمتِ الٰہی حرکت میں آ گیا اور سمندرِ خدائی میں انسانیت کو نجات دلانے کی کشتی دوبارہ چلنے لگی۔ اس مرتبہ اس کشتی کا ناخدا معصومؑ کا ایک خاص نمائندہ ہیں، جن کے سپرد اللہ تعالیٰ نے تمام محروم طبقہ کی فلاح و بہبود اور ان کو دعوتِ توحید دینے کا عمل کر دیا ہے۔

اس بیمثال نمائندہ نے دین اسلام کو اس کے حقیقی خدوخال میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جدید تعبیر کی اور اسلامی نظام چلانے کے بارے میں سب سے پہلے خود مسلمانوں کو پھر پوری دنیا کو نئے طرز اور جدید انداز سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بہت سے رائج مفاہیم کو بدل دیا اور اصولِ حکمرانی سے مربوط کچھ ایسے مفاہیم جدید شکل میں منظرِ عام پر لائے جن سے ہم ناواقف تھے یا ان کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

یہ بے مثال نمائندہ خدا، ''امام خمینی ؒ'' روح خدا ہیں اور حکمرانی کا یہ جدید انداز ''ولایتِ فقیہ'' ہے۔

ولایتِ فقیہ کا اصل نظریہ اگرچہ جدید اور خودساختہ نہیں ہے مگر اس کے منظرِ عام پر آنے پر بعض افراد کی جانب سے اس کے اسلامی نظریہ ہونے پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس کی تاریخ بہت قدیم ہے، چنانچہ اسلامی متون فقہائے عظام کی کتب کا مطالعہ

کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیہ کو امام زمانہؑ سے پہلے کے ادوار میں خود معصومؑ کی جانب سے ولایت وقیادت کا منصب دیا جاچکا ہے چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں مذکورہ روایات سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے۔

علمائے کرام اور مجتہدینِ عظام نے اس موضوع پر اپنے مخصوص فقہی استدلال کے انداز میں بحث کی ہے لیکن یہ تمام بحث اور استدلال صرف کتب کی زینت بن کر رہ گئے تھے اور ہمارے مفکّرین، روشن فکر حضرات بلکہ غیر مُتخصّص علماء (غیر ماہر علماء) بھی تقریباً اس قسم کے نظریہ وطرزِ استدلال سے محروم ونا آشنا رہے۔

لیکن اب پہلی مرتبہ حضرت امام خمینیؒ نے مذکورہ نظریہ کو کتب فقہ اور متون اسلامی سے نکال کر اسے معاشرہ میں نظام اسلام نافذ کرنے کا ذریعہ وطریقہ قرار دیا لہٰذا اس کے متعلق شکوک وشبہات کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ ان شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کا واحد ذریعہ خود ولایتِ فقیہ کے مفہوم سے آشنا ہونا اور سمجھنا ہے اور زیرِ نظر کتاب اس حقیر کی جانب سے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ شاید یہ قدم مذکورہ غرض کی تکمیل اور نوجوان نسل کے لئے مفید ثابت ہو۔

چنانچہ محترم قارئین سے یہ استدعا ہے کہ کسی قسم کی تعمیری تنقید کے اظہار سے دریغ نہ کریں اور اپنے نظریات سے آگاہ کریں۔ (وماتوفیقی الاّ باللہ)

محمد حسن صلاح الدین
۲۔ شعبان المعظّم ۱۴۰۵ھ
۲۳۔ اپریل ۱۹۸۵ء

مقدمہ (طبع سوم)

ولایتِ الٰہی کے تحت ،حکومتِ عادلہ کا قیام ، بندگانِ الٰہی کے لئے ایک بیش بہا نعمت ہے۔جس کی قدر و قیمت اور اہمیت وارزش کا اندازہ ہر ایک نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس کے برعکس ولایتِ طاغوت کے تحت قائم ہونے والی حکومت ،انسانی اقدار اور اخلاقی کمالات کی تباہی و بربادی کے لئے سب سے بڑا موثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔اس کا اندازہ بھی وہی لوگ بہتر طور پر لگا سکتے ہیں جو طاغوتی حکومت میں زندگی گزار چکے ہوں۔حکومتِ طاغوت اور جائر ریاست میں پیدا ہونا،اس میں نشو ونما پانا اور زندگی بسر کرنا خاصانِ خدا کی نگاہ میں تباہی، بربادی اور غیظ وغضب الٰہی کے استحقاق، بالآخرہ شقاوت وخسارت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

حضرت امام حسینؑ ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”.... فَاِنِّیْ لَا أَرَیٰ الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً وَّالْحَیَاةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَماً....“

”میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت صرف اور صرف سعادت ہے اور ظالمین کے ساتھ زندہ رہنا ذلت اور وبالِ جان کے علاوہ کچھ نہیں۔“ (شہیدِ اسلام۔ص ۲۳۱)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے انتہا مہربان ہے۔اس کی نعمتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔

”وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا.“

”اور اگر تم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو ہرگز شمار نہیں

کر سکتے۔" (ابراہیم۔۳۴)

ان رحمتوں میں سے ایک رحمت کا بطورِ خاص، احسان ومنت کے طور پر قرآنِ کریم میں تذکرہ آیا ہے۔

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ إِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِھِمْ....."

"یقیناً اللہ نے صاحبانِ ایمان پر احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔۔۔" (آل عمران۔۱۶۴)

رسولِ اسلام کی بعثت، ان تمام برکتوں کے علاوہ جن کا تذکرہ قرآن وسنتِ مطہرہ میں آیا ہے اس رحمت پر بھی بطورِ خاص مشتمل ہے کہ انسان کو غیرِ خدا اور طاغوت کی ولایت وحکومت سے نکال کر ولایت وحکومت الٰہیہ کی طرف دعوت کا پیغام بھی ہے۔ اور اس نعمتِ عظمیٰ (ولایتِ الٰہی) کے سائے میں، پرسکون آرام بخش زندگی گزارنے اور انسانی اقدار وکمالات کے حصول کی خاطر سیر إلی اللّٰہ کے مراحل طے کرنے کا مناسب موقع میسر آتا ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ فلسفہ بعثتِ انبیاء کے بارے میں فرماتے ہیں:

"... فإن اللّٰہ تعالیٰ بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم لیخرج عبادہ من عبادۃ عبادہ إلیٰ عبادتہ، ومن عھود عبادہ إلیٰ عھودہ، ومن طاعۃ عبادہ إلیٰ طاعتہ، ومن ولایۃ عبادہ إلیٰ ولایتہ"

"بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ اللہ کے بندوں کو انسان پرستی سے نکال کر خدا پرستی کی جانب اور بندوں کے عہدوپیمان سے نکال کر خدا کے عہدوپیمان کی طرف اور بندوں کی ولایت سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی ولایت کی طرف لے جائیں۔" (الحیاۃ۔ج۲ص۲۹)

ولایتِ الٰہی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالٰی نے کچھ دیگر افراد کی ''ولایت'' کا بھی تعیّن فرمایا ہے۔ لہٰذا ان افراد کی ولایت سے دوری اختیار کرنے کی صورت میں، ولایتِ الٰہی کے سائے میں متنعّم [انعام پانے والا] ہونا غیر ممکن ہے۔

''إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه' وَالَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ''

''(اے ایمان والو!) بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسولؐ اور صاحبانِ ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکٰوۃ دیتے ہیں۔'' (المآئدہ۔۵۵)

ولایت (حکومت) کسی صالح قانون اور نظام کے بغیر بے معنی تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالٰی نے اپنے لطف وکرم سے انسانیت کی فلاح و بہبودی اور مکمل کامیابی کے لئے قیادت (یعنی ولایتِ الٰہیہ) کے ساتھ ایک جامع وہمہ گیر نظام بھی عطا کیا ہے؛ اور وہ ہے اسلام کا نظام۔

''أَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً ......''

''آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔'' (المائدہ۔۳)

یہاں تک اللہ تعالٰی نے پوری انسانیت کی ہدایت، سعادت اور نجات کے ضروری امور کا اہتمام کرلیا۔

۱۔ نظام وقانون

۲۔ ولایت (قیادت) کی نشاندہی

یعنی اللہ تعالٰی کے بیک وقت تین ولایتوں کا تذکرہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں کے درمیان گہرا ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اور ہر ایک دوسری سے مضبوط انداز میں جڑی ہوئی ہے

کہ اگر ایک ولایت کے تسلسل کا فقدان ہو جائے تو یہ قطعاً دوسری ولایت کے فقدان کا ہم معنی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں ولایتوں (اللہ، رسولؐ اور امیر المومنینؑ کی ولایت) کا سلسلہ امتِ اسلامیہ پر ایک مختصر مدت قائم رہی۔ اس کے بعد ولایتِ مذکورہ سے انحراف کی وجہ سے اسلامی نظام اور قیادت (ولایت) دونوں بحران کا شکار ہو گئے اور آج تک یہ مضبوط اور مستحکم شکل میں جاری ہے۔

تاریخِ ولایت

ولایتِ حضرت رسول اکرمؐ مدینہ منورہ کے عہدِ حکومت پر مشتمل ہے۔ عہدِ مکی میں ولایتِ رسول اکرمؐ کا خاطر خواہ ظہور و نمود نہیں تھا۔

ولایتِ رسول اکرمؐ کے بعد تدبیر الٰہی کے تحت تیسری ولایت کا نافذ ہونا مقرر کیا گیا تھا مگر عملی میدان میں ہوا کچھ اور۔ سن ۱۱ ہجری کے اوائل سے ۳۵ ہجری یعنی ۲۵ سال تک قیادتِ اہل البیتؑ (ولایت) سے پوری امت محروم رہی اور اہل البیتؑ کو گوشہ نشین کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ سن ۳۵ ہجری میں خلیفہ سوئم عثمان بن عفان کے قتل کے بعد یہ سلب شدہ حق (ولایت) دوبارہ اہلِ حق (علیؑ ابن ابیطالبؑ) کو واپس ملا۔

"ولهم خصائص حق الولاية وفيهم الوصية والوراثة الآن إذ رجع الحق إلىٰ أهله ونقل إلىٰ منتقله"

"۔۔۔حق ولایت کی خصوصیات انہی (آلِ محمدؐ) کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں (پیغمبرؐ کی) وصیت اور انہی کے لئے (نبیؐ کی) وراثت ہے۔ اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہو گیا۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ)

مگر امتِ اسلامیہ کے اندرونی حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے اور اسلامی نظام میں بنیادی تحریفات داخل ہو چکی تھیں۔ اور اصولِ حکمرانی اور عدل وانصاف پر مبنی حکومت کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ احمد امین مصری، مروان بن حکم کے دورِ وزارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"إن مروان هذا وشيعته قدهدموا كل ما بناه الاسلام من قبل"

"مروان اور اس کے ساتھیوں نے ہر اس چیز کو تباہ و برباد کر دیا جس کی بنیاد اسلام نے رکھی تھی۔" (شہیدِ اسلام۔۱۱۵)

مدینہ منورہ میں تمام مسلمانوں (اہل مدینہ اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں) نے مسجد نبوی میں کسی جبر واکراہ کے بغیر اور اپنی خوشی و رضا سے اپنے خلیفہ وفرمانروا کے طور پر حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالبؑ کو منتخب کیا اور غدیرِ خم کے بعد ایک بار پھر ان کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی۔

سن ۳۵ ہجری سے ۴۰ ہجری تک (عہدِ خلافتِ ظاہرہ) ولایتِ ثالثہ پر مبنی اسلامی حکومت کی تشکیلِ نو عمل میں آئی۔ مگر ایک گہری سازش کے تحت اسے پوری توجہ اور اطمینانِ خاطر سے اسلام کی نشر واشاعت، مسلمانوں کی خدمت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کی فکری، عقائدی، تعلیمی و تربیتی، عملی اور اخلاقی تمام مسائل کا حل پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ اس نوپا حکومت کی اکثر توانائی اندرونی بغاوت کو کچلنے میں صرف کی گئی۔

اندرونی شورش و بغاوت کو کچلنے میں مصروف ہونے کے باوجود، خلافت وولایت پر مبنی اس مختصر عہد کی حکومتِ عادلہ کی علمی، فکری، انسانی اقدار اور اصولِ حکمرانی پر مشتمل تعلیمات، نہج البلاغہ کی شکل میں "بے بہا انسانی تحفہ" کے طور پر آج بھی زندہ ہیں۔

بہر حال اسلام دشمن عناصر، دنیا پرست طبقہ، اسلاف کے خون کے انتقام کے طالب افراد اور احمق و بے وقوف لوگوں کی مشترکہ جدوجہد سے "عدالتِ انسانی کی آواز" کو شہرِ کوفہ کی

جامع مسجد میں دبا دیا گیا اور سالوں سال کی ناامیدی کے بعد، عدل وانصاف کی گسترش اور ''ولایتِ الٰہیہ'' کے تحت قائم ہونے والی حکومتِ عادلہ سے وابستہ امیدوں کی ساری کرنیں بھی ہمیشہ کے لئے خاموش کردی گئیں۔ اور صدرِ اسلام کے مختصر عہد کے علاوہ ''صاحبانِ ولایتِ ثالثہ'' (ائمہ اہل البیتؑ) کو امتِ اسلامیہ کی ہمہ گیر قیادت سنبھالنے کا موقع نہیں ملا۔

پھر بنی امیہ کے ۹۱ سالہ عہدِ حکومت [1] اور بنی عباس کے تقریباً پانچ سو پچیس (۵۲۵) سالہ عہدِ حکومت [2] میں شیعہ اور فقہائے شیعہ سخت مشکلات اور انسانیت سوز مظالم و جرائم کا ہدف بنتے رہے۔ اس کے بعد عہدِ خلافتِ عثمانی بھی سابقہ دو عہدوں سے ہرگز بہتر نہیں تھا۔ ظلم وستم اور قتل وغارت یعنی بدترین دہشت گردی کا عالم رہا۔ صرف ترکی میں سلطان سلیم اول کے عہد میں چالیس ہزار شیعوں کو ایک ہی کارروائی میں تہہ تیغ کر دیا گیا۔ (الہجرۃ العاملیہ الی ایران۔ ۳۴)

شد اعداد این کشتہ ہای دیار　　فزوں از حساب چہل ہزار

مذکورہ ظلمت کدوں اور تاریخ کے ان تاریک ترین ادوارِ ثلاثہ (عہدِ بنی امیہ، بنی عباس اور خلافتِ عثمانیہ) میں رہنے والے شیعہ بالعموم اور بالخصوص فقہائے کرام کا ذہن ایک خاص نوعیت کا بن گیا کہ سیاست میں دخل اندازی وہی لوگ کرتے ہیں جو ظالم و جابر اور فاسق ہیں مگر متقی، پرہیزگار اور دیانت دار تو بس وہی لوگ ہیں جن کا تنہا ''علم وعمل'' سے سروکار ہوتا ہے اور اسی طریقۂ زیست میں نجات اور سعادت کی کنجی پوشیدہ ہے۔ بلکہ سیاسی اور ملکی معاملات میں مداخلت کرنا خاصانِ خدا اور علمائے کرام کی شان کے منافی ہے۔

آہستہ آہستہ، اس ذہنیت کے مطابق سیاست میں دخل اندازی نہ کرنا ایک مسلمہ اصول میں شمار کیا جانے لگا۔ لہٰذا فقہاء کے توسط سے اسلامی حکومت کی تشکیل کی ضرورت پر زور

---

[1] معاویہ کی بیعت۔ ۴۱ھ سے زوالِ حکومتِ بنی امیہ ۱۳۲ھ تک تقریباً ۹۱ سال بنتے ہیں۔ (الدولۃ الامویہ۔ محمد الخضری بک)

[2] ۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ

دینا اور بطورِ خاص اس کی راہ میں عملی اقدام اور جد وجہد کرنا تو دور کی بات، اس ذہنیت کے خلاف کوئی نظریہ بھی پیش کیا جانا مشکل تھا۔

چنانچہ یہ ایک قدرتی نتیجہ تھا کہ "ہم رنگِ جماعت باش" کے مقولے کو چراغِ راہ بنا کر، رائج طریقے پر چلنے کو عافیت کا سامان سمجھ لیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا عین حقیقت ہے کہ "ولایتِ الٰہیہ" سے دوری اور ولایتِ انسان (ولایتِ طاغوت) کی اطاعت کا طبیعی نتیجہ یہی روش تھی۔

ولایتِ الٰہیہ کی بازگشت ایک بار پھر

سابقہ مباحث سے یہ واضح ہوا کہ سن ۴۱ھ میں امتِ اسلامیہ "ولایتِ الٰہیہ" سے محروم ہوگئی تھی اور سالہا سال ولایتِ فردِ واحد (حاکم، خلیفہ) کے سایہ میں زندگی کے تمام معاملات چلانے پر مجبور تھی۔ مگر ایران میں صفوی خاندان (پھر دوسرے خاندانوں) کی حکومت کے قیام سے، ایک بار پھر ولایتِ فقیہ "ولایتِ الٰہیہ" سیاسی سطح پر نمایاں ہوئی۔ [1]

ایران پر صفوی حکومت کے قیام پھر آہستہ آہستہ اس کی وسعت میں اضافہ اور استحکام نے مجموعی طور پر حالات بدل کر رکھ دیا اور پہلی بار وسیع پیمانہ پر شیعی حکومت کی تشکیل سے، علماء وفقہائے عظام کو حکومتی سطح پر نیابتِ امام زمانہؑ کے عنوان سے، ولایتِ فقیہ کے نفاذ کا موقع ملا۔

شاہ اسمٰعیل اول ۱۴ رجب ۹۳۰ھ کو بمقام "چالیدران" میں عثمانی حکومت کی جارحیت کا مقابلہ کرتے ہوئے شکست سے دوچار ہوا اور اس کے نتیجے میں وفات پائی۔

وہ تقریباً ۲۴ سالہ دورِ حکومت میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ آذربائیجان، عراق (نجف، کربلا، بغداد، سامراء)، خراسان، فارس، کرمان اور خوزستان کے مقامی سرداروں کی حکومتوں کے خاتمے کے بعد ایک مرکزی "حکومتِ واحدہ" تشکیل دی گئی

---

[1] صفوی خاندان کی حکومت کا آغاز سن ۹۰۷ھ، ۱۵۰۲ء شاہ اسمٰعیل اول کے اعلانِ بادشاہت سے ہوا اور شہر تبریز کو دارالخلافہ قرار دیا گیا۔ الہجرۃ العاملیہ ۲۲

تھی۔(الہجرۃ العاملیہ۔۲۳)

مطلق العنان حکومت

اگرچہ شاہ اسمٰعیل اول کی حکومت دوسرے بادشاہوں کی حکومتوں کی طرح مطلق العنان تھی اور عملی میدان میں کبھی ظلم وجور اور کبھی عدل وانصاف سے کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض شیعہ فقہاء کے ہاں وہ غاصب وظالم حکومت تصور کیا جاتا تھا۔مگر بعض دیگر فقہاء نے اسلام اور ملک کے منافع اور مصلحتوں کے تحت نیز بیگانوں اور ملحدوں کے حملوں سے اسلام کو بچانے اور اسے تحفظ وتقویت بخشنے کے لئے تنہا چارۂ کار اور نجات کی راہ اسی میں پائی تھی کہ صفوی بادشاہوں کی حمایت کریں۔اسی وجہ سے علماء کی ایک جماعت نے حکومتی دستگاہ سے محکم روابط برقرار رکھے تھے۔(ولایت ودیانت،اردو ترجمہ۔ص۹۵ تا ۹۷)

شاہ طہماسب

شاہ اسمٰعیل کی وفات کے بعد اس کا فرزند طہماسب اول تقریباً ۵۵ سال [۱] حکومت پر قابض رہا۔

حکومتِ صفوی میں دینی مناصب

حکومتِ صفوی کے اندرونی نظامِ حکومت کا جائزہ لینے سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ولایتِ فقیہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوچکی تھی۔اس لئے کہ حکومت کرنے کا جواز،ولایتِ فقیہ سے وابستہ تھا اور ان کا سیاسی ومذہبی عقیدہ اور نظریہ یہ تھا کہ حاکم،فقیہ کا نائب اور فقیہ امام زمانہؑ کا نائب ہے۔

مذکورہ عقیدہ ونظریہ کے مطابق،اندرونِ حکومت،علماء کے لئے تین مناصب مقرر کئے گئے تھے۔

---

[۱] ۹۳۰ھ تا ۹۸۴ھ۔۱۵۲۴م تا ۱۵۷۶م

پہلا منصب: شیخ الاسلام یا رئیس العلماء

یہ منصب سب سے بڑا منصب تصور کیا جاتا تھا اور شیخ الاسلام کی جگہ شاہ کے دربار میں ہوا کرتی تھی۔ تمام شرعی مسائل وغیرہ میں تحقیقات کرنا، مظلوموں کی دادرسی اور شاہ کے پاس برآوریٔ حاجات کے لئے سفارش کرنا وغیرہ اس عہدہ سے مربوط تھا۔ چنانچہ شیخ الاسلام یا رئیس العلماء، ملک کا قاضیٔ اعلیٰ (چیف جسٹس) بھی تھے۔ (الہجرۃ العاملیہ۔۱۹۳)

ولایتِ فقیہ کا تاریخی فرمان

مذکورہ بالا منصب پر سب سے پہلے، شاہ طہماسب کے ایک فرمان کے تحت، جناب علی ابن عبدالعالی کرکی [1] فائز ہوئے۔

فرمان کا عربی متن اور ترجمہ:

بسم الله الرحمن الرحيم

حيث انه يبدو ويتضح من الحديث الصحيح النسبة الى الامام الصادق عليه السلام "انظروا الى من كان منكم قد روى حديثنا، ونظر فى حلالنا وحرامنا، وعرف احكامنا فارضوا به حكما، فاني قد جعلته حاكما، فاذاحكم بحكم فمن لم يقبله منه فانما بحكم الله استخف، وعلينا رد، وهو راد على الله، وهو على حد الشرك، وواضح ان مخالفة حكم المجتهدين الحافظين لشرع سيد المرسلين، هو والشرك فى درجة واحدة. لذلك فان كل من يخالف

---

[1] فقہاء کے درمیان محقق ثانی یا محقق کرکی کے نام سے مشہور ہے۔ [ولادت ۸۷۰ھ وفات ۹۴۰ھ۔ ۱۴۶۵ء تا ۱۵۳۲ء]

حکم خاتم المجتهدین، ووارث علوم سید المرسلین، ونائب الائمة المعصومین علیهم السلام، لایزال کاسمه العلی علیا عالیا، ولایتابعه، فانه لامحالة مردود، وعن مهبط الملٰئکة مطرود، وسیؤاخذ بالتأدیبات البلیغة و التدبیرات العظیمة.

کتبہ:

طهماسب بن شاه اسمٰعیل الصفوی الموسوی"

ترجمہ:

"جب یہ واضح وروشن ہوا اس صحیح السند روایت سے جو حضرت امام جعفر الصادقؑ سے مروی ہے: "دیکھو جو تم میں سے ہماری احادیث کا راوی ہو، ہمارے بیان کردہ حلال وحرام پر اس کی نگاہ ہو اور ہمارے احکامات سے آگاہ ہو تو اس کو اپنا حکم وقاضی بناؤ۔ اس لئے کہ میں نے اس کو تم پر حاکم بنایا ہے۔ اگر کوئی اس کے فیصلے کو مسترد کرے تو بے شک اس نے حکمِ خدا کو مسترد کیا، اور ہمارے فرمان کو رد کیا۔ دراصل وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو رد کرنے والا ہے اور یہ شرک کی منزلت کے برابر ہے۔"

بے شک مجتہدین کے (جو کہ شریعتِ محمدی کے نگہبان ہیں) احکامات کی خلاف ورزی اور شرک برابر ہے۔ لہٰذا جو شخص خاتم مجتہدین وارثِ علومِ سید المرسلین اور نائبِ ائمہ معصومینؑ اپنے نام (علی) کی طرح ہمیشہ بلند اور اونچا ہیں، کے احکامات کی مخالفت کرے اور پیروی نہ کرے، بلاشبہ ملعون ومردود ہوگا۔ اور مہبط (محل نزول) ملائکہ

سے متروک (دور) ہوگا۔ چنانچہ سخت تنبیہات اور عظیم تدبیرات سے اس کا مواخذہ کیا جائے گا۔

تحریر: طہماسب بن شاہ اسمٰعیل صفوی موسوی (الہجرۃ العاملیہ۔ص۱۲۶)

ولایتِ فقیہ کا دوسرا فرمان اور وسیع اختیارات

دوسرا فرمان پہلے کی نسبت طویل ہے۔ ہم بوجہِ اختصار اس کے اہم مطالب کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ مذہبِ تشیع کا فروغ، صفوی حکومت کا نصب العین ہے۔ تاکہ ظہورِ امام زمانہؑ کے لئے ماحول تیار ہو۔

۲۔ مذکورہ بالا مقصد کا حصول علمائے دین کی پیروی کے بغیر ناممکن ہے۔ علماء اپنے علم ومعرفت کے ذریعے لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

۳۔ شیخ علی کرکی عصر حاضر کے سب سے بڑے عالم اور نائبِ امام ہیں۔

۴۔ لہٰذا شاہ (طہماسب) دولت وحکومتِ صفوی کے اہداف کے حصول کی خاطر حکومت کے تمام ارا کین کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ جناب خاتم مجتہدین، وارثِ علوم سید المرسلینؐ، نگہبانِ دینِ امیر المومنینؑ، قبلہ متقین، قدوۃ العلماء حلال وحرام بیان کرنے والا ''نائبِ امام'' علیہ السلام علی بن عبد العالی (کرکی) کو اپنا مقتدیٰ وامام تسلیم کریں۔ ان کے احکامات کی مکمل تعمیل اور تمام امور میں مکمل اطاعت کریں۔

۵۔ شیخ علی کرکی مستقل طور پر، امورِ شرعیہ کے متصدی ملازمین کو نصب وعزل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر کسی کو کسی عہدے پر نصب کیا تو وہ برقرار رہے گا اور اگر کسی کو عزل کیا تو وہ معزول ہوگا۔

۶۔ جس چیز کا وہ حکم کرے وہ نافذ العمل ہوگا۔ اور جس چیز سے وہ روکے وہ ممنوع

ہوگی۔ کتبہ:طہماسب۔تحریر:۱۶ ذوالحجۃ الحرام ۹۳۹ھجری

(الہجرۃ العاملیۃ۔۱۲۸۔۱۲۹)

مذکورہ بالا دوفرمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہیں ولایتِ فقیہ کی بنیاد پر اسلام میں سب سے پہلے سیاسی و مذہبی فرمان تصور کیا جاتا ہے۔

جناب شیخ الاسلام علی کرکی وسیع اختیارات کے مالک تھے۔اور حکومت کی سطح پر بے انتہا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک تاریخ نگار نے لکھا" کان فی ذلک الحین ملک ایران واھلھا" یعنی" اس وقت جناب شیخ علی کرکی ہی ایران واہلِ ایران کا بادشاہ تھا۔" (الہجرۃ العاملیۃ۔۱۲۷)

لہذا جناب شیخ علی محقق کرکی دیگر گورنروں کو مکتوبات و حکم نامے ارسال کرتے رہتے تھے جو کہ عدل وانصاف کرنے ،رعیت کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور خراج ومالیات اخذ کرنے سے متعلق ہدایات پر مشتمل ہوتے تھے۔چنانچہ بڑے بڑے عہدیداروں کو عزل ونصب بھی کرتے تھے۔(الہجرۃ العاملیۃ۔۱۲۷)

مرکز میں یہ منصب تقریباً ایک صدی تک لبنان سے ہجرت کرکے آنے والے علماء کے پاس رہا۔چنانچہ شیخ الاسلام محقق کرکی کی وفات کے بعد مندرجہ ذیل علماء علی الترتیب "شیخ الاسلام" یا "رئیس العلماء" کے منصب پر فائز ہوئے:

۱۔علی بن ہلال کرکی

۲۔شیخ بہائی

۳۔میر داماد

۴۔مرزا علی کرکی

۵۔مرزا محمد مہدی کرکی (الہجرۃ العاملیۃ۔۱۹۳)

۶۔سید حسین خوانساری

۷۔محمد باقر مجلسی۔صاحب بحارالانوار (الہجرۃ العاملیۃ۔۱۹۵)

صوبائی شیخ الاسلام

مرکز کے علاوہ، ہر شہر اور صوبوں میں بھی شیخ الاسلام کا منصب ہوا کرتا تھا۔اور اس منصب پر فائز بعض علماء کے اسماء یہ ہیں:

۱۔شیخ بہائی کے والد شیخ عبدالصمد۔قزوین پھر مشہد پھر ہراۃ کے۔

۲۔سید حسین بن محمد۔مشہد کے

۳۔محمد بن الحسن الحر (صاحب وسائل الشیعہ) مشہد کے۔

۴۔شیخ محمد الجواد الجامعی شوشتر کے شیخ الاسلام تھے۔ (الہجرۃ العاملیۃ۔۱۹۳،۱۹۴)

دوسرا منصب: صدارت

شیخ الاسلام کے بعد دوسرا منصب ''صدارت'' کا تھا۔اس کا رسمی نام ''اعتمادالدولۃ'' تھا۔ایوان و دربار شاہ میں شرع کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا۔اس کی ذمہ داریوں میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ پوری مملکت میں اسلامی نظام و احکامِ شریعت کے نفاذ و عدمِ نفاذ پر کڑی نظر رکھنا۔

☆ اوقاف کے معاملات میں نظم و ضبط پیدا کرنا۔اور ذیلی عہدوں جیسے اوقاف کے ملازمین، ائمہ مساجد اور مدرسین وغیرہ کی مکمل نظارت کرنا۔

اس عہدے پر فائز افراد میں میرزا حبیب اللہ کرکی پھر ان کا بیٹا میرزا مہدی شامل ہیں۔(الہجرۃ العاملیۃ۔۱۹۴)

تیسرا منصب: قضاوت

حکومت میں تیسرا دینی منصب ''قضاوت'' کا تھا۔لوگوں میں پیدا ہونے والے عائلی اور حقوقی اختلافات میں فیصلہ کرنا۔(الہجرۃ العاملیۃ۔۱۹۴)

مذکورہ مطالب و زمینی حقائق، وقت کی ضرورت کے مطابق رونما ہوئے۔یعنی ایک

شیعہ حکومت کی تشکیل کے بعد اس کی شرعی حیثیت کا تلاش کرنا نہایت ضروری تھا۔لہٰذا شیعہ ذہنیت میں پایا جانے والا ارتکازی شرعی جواز ایک جانب اور دوسری جانب، شرعی دلیل کے مطابق، زمانِ غیبتِ کبریٰ میں فقیہِ جامع الشرائط کو میدانِ سیاست میں آنا پڑا۔اور عملاً فقہائے اسلام کی ولایت اور سرپرستی کا سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔

دوسری جانب جناب مرحوم مولا احمد نراقی نے جو کہ فتح علی شاہ قاچار کے ہم عصر تھے، (ولایت ودیانت ۶۹) تاریخِ فقہِ سیاسی شیعہ میں، پہلی بار، ولایتِ فقیہ کے بارے میں ایک جامع اور متین بحث کی جو آپ کی مشہور کتاب ''عوائدالایام'' کا ایک حصہ ہے۔

پھر ان کے بعد آنے والے علماء کبھی مختصر انداز میں (جیسے صاحبِ جواہرؒ) اور کبھی تفصیل کے ساتھ (جیسے شیخ اعظم انصاریؒ) ولایتِ فقیہ کے موضوع پر بحث کرتے آئے ہیں۔مگر ولایتِ فقیہ کے مختلف پہلوؤں پر جامع اور وسیع پیمانے پر بحث وگفتگو حضرت امام خمینیؒ نے کی ہے۔

طبعِ سوم

کتاب کے طبع سوم میں ایک مقدمہ اور کچھ ضمیمہ جات کا اضافہ کیا گیا ہے۔تاکہ ولایتِ فقیہ کے مفہوم کے ادراک اور اس سے متعلق شکوک وشبہات کو ازالہ کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہو۔

''اسئل اللّٰہ عزوجل أن یجعل ھذا العمل ذخرا لی ولوالدی یوم لاینفع مال ولابنون الامن أتی اللّٰہ بقلب سلیم۔''

صلاح الدین

۲۸ صفر المظفر ۱۴۲۹ھ بمطابق ۷ مارچ ۲۰۰۸ء

جامعۃ العلوم الاسلامیہ

جعفر طیار سوسائٹی ملیر کراچی

اقسامِ ولایت

ولایت کی دو قسمیں ہیں:۔

ا۔ ولایتِ تکوینی (کائناتی ولایت)

۲۔ ولایتِ تشریعی (قانونی ولایت)

ا۔ ولایتِ تکوینی (کائناتی ولایت)

ولایتِ تکوینی (کائناتی ولایت) اور اس کی تمام اقسام خود ذاتِ خداوندی سے مخصوص ہیں۔ البتہ ولایتِ تکوینی کی بعض اقسام میں معصومینؑ کو حق ولایت حاصل ہے، جن کا ذکر کیا جائے گا۔ ولایتِ تکوینی کی چند اقسام ہیں، جن کا یہاں مختصر ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

الف۔ ولایتِ خلق (تخلیقی ولایت)

ب۔ ولایتِ تدبیر (ولایتِ امر)۔

الف۔ ولایتِ خلق (تخلیقی ولایت)

ولایتِ خلق سے مراد یہ ہے کہ تمام کائنات کی ایجاد ذات الٰہی سے وابستہ ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی اور خالق نہیں ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

''اَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ

''آگاہ ہو کہ بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے اللہ کُل عالمین کا پرورش کرنے

والا، صاحبِ برکت ہے۔" (الاعراف ۵۴)

"قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ."

"تم یہ کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا زبردست ہے۔" (الرعد ۱۶)

"هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ."

"آیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہے جو آسمان وزمین سے تم کو روزی دے رہا ہے۔" (فاطر ۳)

"اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ."

"کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا کے بارے میں تم کو شک ہے؟" (ابراھیم ۱۰)

مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر چیز کی خالق خود ذات الٰہی ہے اور اس ذات کے علاوہ کوئی بھی خالق بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم نے ایک اور طریقہ وانداز اختیار کیا ہے اور وہ ہے ناتوانی اور عاجزی کا احساس دلانا۔ یعنی اگر واقعاً کوئی قابل پرستش اور شریک خالق ہے تو کم سے کم ایک چیز ایجاد اور خلق کر کے اپنی خلاقیت کا ثبوت دے۔

"اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْأَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ."

"ذرا مجھے تو دکھاو آیا زمین کی کوئی چیز انہوں نے پیدا کی ہے یا آسمانوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے؟" (فاطر ۴۰)

"اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ."

"کیا ان کو شریک ٹھہراتے ہو جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود ہی پیدا

کئے جاتے ہیں۔" (الأعراف ۱۹۱)

ان کے علاوہ بھی متعدد قرآنی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کا خالق حقیقی خداوند عالم ہے اور کوئی فردِ خلقتِ کائنات میں شریک نہیں۔

مختصر یہ کہ مندرجہ ذیل امور سے مفہوم خالق کا خلاصہ بیان کیا جاسکتا ہے۔

(i) کائنات کے تمام مواد کو خداوند عالم نے خود پیدا کیا ہے۔

(ii) جمادات کی ہیئت وشکل اور تمام صورتوں کی خالق خود ذات الٰہی ہے۔

(iii) ذی روح مخلوقات کے جسم وروح کی خالق خود ذات الٰہی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ کسی چیز کی ہیئت یا صورت کی ایجاد کے لئے کسی مستقل حکم یا خالق کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صورت مادّہ کی تابع ہے جہاں مادّہ موجود ہوتا ہے وہاں صورت بھی لازماً موجود ہوتی ہے (لازم لا ینفک) لہٰذا خدا پر ہیئت وشکل کے خالق کا اطلاق مادّہ کی تخلیق اور ایجاد کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

مذکورہ بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم میں غیر خدا کے لئے لفظ "خالق" کے استعمال سے کیا مراد ہے۔ آیا وہ واقعاً اللہ کا شریک ومددگار ہے؟ یا وہ خود خالق، مستقل اور جداگانہ حیثیت کا مالک ہے؟ یا لفظ خالق کے اطلاق سے مراد کچھ اور ہے؟

چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:۔

"اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَأَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِأِذْنِ اللّٰهِ"

"بیشک میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی صورت پیدا کردوں گا پھر اس میں پھونک ماروں گا پھر وہ حکم خدا سے پرندہ بن جائے گا۔" (آلعمران ۴۹)

"وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ بِأِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَافَتَکُوْنُ

طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي."

"(اے عیسیٰؑ اس وقت کو یاد کر) کہ جس وقت تم میرے حکم سے گندھی ہوئی مٹی (گل) میں سے پرندے کی شکل وصورت بناتے تھے پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور یہ کہ تم میرے حکم سے زندہ کرتے تھے۔" (مائدہ ۱۱۰)

مذکورہ آیات خود اس بات کی روشن گواہ ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ بطور معجزہ ایسے کام انجام دیتے تھے جن کا ذکر آیات میں ہوا ہے بذات خود خالق ہونے کا انہوں نے نہ دعویٰ کیا ہے اور نہ انہوں نے خالق کا کام (مستقلا) انجام دیا ہے ان کا کام صرف مواد جمع کر کے اسے شکل وصورت میں ڈھالنا تھا اور یہ کام ہر انسان انجام دے سکتا ہے مگر اس کام کے معجزہ ہونے کی وجہ وہ "روح" ہے جو اس شکل میں داخل ہو کر ایک حقیقی پرندہ بن جاتی ہے۔ یہ کام خدا کے حکم سے حضرت عیسیٰؑ کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ اس بنا پر حضرت عیسیٰؑ صرف مظہر ہیں، پرندہ کے حقیقی خالق نہیں۔

اس لئے مردہ کو زندہ کرنا اور جذام و برص کے مریضوں کو شفا دینا درحقیقت خداوند عالم کا کام ہے۔ لیکن یہ کام ہر شخص کے ذریعے انجام نہیں پا سکتا بلکہ اسکا ذریعہ خدا کے مخصوص بندے ہی بنتے ہیں اور اسی کا نام معجزہ ہے۔ اس قسم کے افعال واعمال سے اس راز واسرار کا سراغ ملتا ہے جو خالق اور اس کی مخصوص مخلوق کے درمیان رسالت ونبوت کی شکل میں قائم ہے۔ آیات قرآنی کے علاوہ نصوصِ ائمہ اہلبیتؑ اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ خداوند عالم کے علاوہ کوئی خالق ہے اور نہ رازق۔ دعائے جوشن کبیر کے چند فقرے یہاں نقل کرتے ہوئے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں جو کہ خالقیت کو صرف اللہ تعالیٰ میں منحصر رکھنے کے بارے میں کی گئی ہے۔

"يَا مَنْ لَا يَخْلُقُ الْخَلْقَ إِلَّا هُوَ"

''اے وہ ہستی کہ مخلوقات کو جس کے سوا کوئی پیدا نہیں کرتا۔'' (فصل ۹۱)

''یَامَنْ ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ ''

''اے وہ ہستی کہ جو ہر چیز کو پیدا کرنے والی ہے۔'' (فصل ۱۷)

''یَامَنْ لَّا یُحْیِ الْمَوْتٰی اِلَّا ھُوَ ''

''اے وہ ذات کہ جس کے سوا کوئی مردہ کو زندہ نہیں کرتا۔'' (فصل ۹۱)

ب۔ ولایتِ تدبیری (ولایتِ امر)

ولایتِ تکوینی کی دوسری قسم ولایتِ تدبیری ہے، یعنی ہر چیز کو خلق اور پیدا کرنے کے بعد اس کے وجود کی بقا، نشو ونما اور ارتقاء وغیرہ کے قوانین بنانے والا صرف خداوند عالم ہے البتہ اس مقصد کے حصول کے لئے اللہ تعالی نے تمام مخلوقات کو ایک ایسا نظام حیات دیا ہے جس کے تحت ہر چیز اپنے کمال تک پہنچ سکتی ہے اور اس عالم کو عالم علل ومعلول قرار دینے کی وجہ سے ہر چیز کی علت اور اس کیلئے ضروری نظام کا سرچشمہ خود ذات باری ہے اور ہر چیز کا قانون طبیعت اور دستور حیات اسی ذات کے اختیار اور ارادے کے تحت وضع کیا گیا ہے۔

''اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ''

''دیکھو حکومت اور پیدا کرنا بس خاص اسی کیلئے ہے۔'' (الاعراف ۵۴)

''وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا ''

''ہر آسمان میں بذریعہ وحی اس کے مناسب حال حکم پہنچادیا۔'' (فصلت ۱۲)

''یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ''

''آسمان سے زمین تک کے معاملے کی تدبیر وہی (اللہ) کرتا ہے۔'' (السجدہ ۵)

۲۔ولایتِ تشریعی (قانونی ولایت)

اللہ تعالی نے انسان وغیرہ (ذی عقل) کو خود مختار بنا کر خلق کیا اور بے شک خود مختار افراد کے درمیان تصادم، نزاع، ایک دوسرے کے حقوق کو نظر انداز کرنے اور صرف ذاتی مفاد کو مقدم رکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اسلئے اس انسان میں شیطانی قوتوں، حیوانی امتیاز، شہوت پرستی اور شہرت طلبی کا رجحان موجود ہونے کی وجہ سے اس کی زندگی کو معمول پر لانے، اس کے لئے ہر ایک فطری آزادی سے فائدہ اٹھانے، اس کے اپنے پیدائشی حقوق کی نگہداری اور ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کرنے کا انتظام خود خداوند عالم کو کرنا ہے۔ لہذا بنی نوع انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کیلئے قانون ودستور سازی کا حق صرف اسی ذات کو پہنچتا ہے جو اس مخلوق کی تمام داخلی، ظاہری وباطنی خواہشات سے آگاہ ہو۔

بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے کہ ''حقِ تشریع'' یعنی قانون وآئین سازی کا حق صرف خدا کیلئے مخصوص ہے؟ یا خود انسان اپنی عقل وہوش اور ذکاوت سے آناً فاناً وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے آئین وضع کر سکتا ہے؟

اگر چہ یہ بات بحث طلب ہے مگر اس بحث کا نتیجہ اسلامی نقطہء نگاہ سے بالکل واضح ہے کہ توحید الہٰی کو ماننے کے بعد یہ بحث بالکل بے جا ثابت ہوتی ہے۔

بہر حال قانون سازی کی بنیادی شرط علم وآگہی ہے اور اس صفت سے خدا کے علاوہ ہر فرد محروم ہے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس تھوڑا سا محدود علم ہو تو بھی یہ اس کی اپنی ذاتی زندگی کیلئے کافی نہیں ہے چہ جائیکہ اجتماعی زندگی کیلئے کافی ہو۔ نیز قرآن کی منطق کے مطابق حکم خدا کے خلاف کوئی بھی حکم ہو وہ گمراہی اور اس کا حاکم گمراہ کن اور طاغوت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

''وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ .''

''اور جو اسلام کے علاوہ کسی دین کا خواستگار ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اوروہ روزقیامت نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔'' (آلعمران۔ ۸۵)

''وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ ''

''اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے (فرمان) کے مطابق حکم نہ کرے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔'' (مائدہ ۴۴)

''وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِکَ هُمُ الظّٰالِمُوْنَ ''

''اور جو لوگ اس کے مطابق حکم نہ کریں جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے پس وہی لوگ ظالم ہیں۔'' (مائدہ ۴۵)

''وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ''

''اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے (فرمان) کے بموجب فیصلہ نہ کرے وہی لوگ فاسق ہیں۔'' (مائدہ ۴۷)

''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفَاصِلِیْنَ ''

''اختیار و حکم صرف اللہ ہی کو ہے وہ حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔'' (انعام ۵۷)

''اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعاً وَّکَرْهاً وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ''

''دین خدا کے سوا وہ کسی اور دین کے خواستگار ہیں؟ حالانکہ جو آسمانوں اور زمین میں ہے خواہ مخواہ اس کے مطیع ہیں اور اسی کے حضور پلٹ کر جائیں گے۔'' (العمران۔ ۸۳)

اس بنا پر ولایت کی دونوں قسمیں ''تکوینی'' اور ''تشریعی'' درحقیقت ذات الٰہی سے

مخصوص ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض مخصوص بندوں کو ولایتِ تکوینی کے بعض شعبوں سے نوازا ہے۔اس بارے میں اگرچہ کافی بحث وتمحیص اور جدال ونزاع ہوا ہے پھر بھی ایک چیز پر تمام اسلامی فرقے متفق ہیں کہ معجزات انبیاءؑ اوران کے ہاتھوں پر ظاہر ہونے والی کرامات، ایک نوع تصرف اور کائناتی ولایت کی روشن دلیل ہیں۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انبیاء عظام، سید المرسلینؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی ولایتِ تکوینی تمام علمائے شیعہ اور روایات اہلبیتؑ کے مطابق ثابت ہے اگرچہ اس کی تفصیل اور تشریح میں اختلاف ہے۔

چونکہ یہ بحث زیرِ نظر کتاب کے اصل موضوع سے خارج ہے اس لئے اس پر فی الحال کوئی دلیل پیش کرنے کی بجائے اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔

تمام انبیاءؑ کے لئے ولایتِ تشریعی کا ثبوت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء ومرسلینؑ کو ایک نوع ولایت اور اختیار دے کر بھیجا ہے جس کا نام ولایتِ تشریعی اور حکومت ورسالت اعتباری ہے۔

مذکورہ لفظ ''ولایتِ تشریعی'' سے کوئی شخص اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے قانون وآئین سازی کا اختیار انبیاءؑ کو دے دیا ہے یعنی درحقیقت قانون سازی کا حق خود ذات الٰہی کو حاصل تھا لیکن انبیاءؑ کی بعثت کے بعد سے خدا نے یہ حق انبیاءؑ کے حوالے کر دیا یہ ایک لفظی غلط فہمی ہے جو لفظِ ''تشریع'' سے ہوتی ہے۔حقیقت میں اس سے مراد یہ ہے کہ قانون سازی کا حق صرف ذات الٰہی کو حاصل ہے اور اللہ اس حق سے کبھی بھی دست بردار نہیں ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے حوالے کیا ہے بلکہ انبیاءؑ حکم خدا کو لوگوں تک پہنچانے اور اسے لوگوں پر نافذ کرنے کا پورا پورا حق رکھتے ہیں جب کہ خود کسی قانون کو وضع کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔

''اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ'' (الانعام۔۵۷)

''حکومت (حکم کرنے کا حق) تو صرف خدا ہی کے لئے ہے۔''

''وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ.''

"اگر رسول ہماری نسبت کوئی جھوٹ بات بنالاتے تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔" (الحاقّة ۴۴،۴۵).

اس بنا پر رسول خدا احکام کے مبیّن و مفسّر اور شریعت کو نافذ کرنے والے ہیں "فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ" چنانچہ ولایت تشریعی کا مفہوم یہ ہوا کہ انبیاءؑ اور رسولانِ الٰہیؑ کو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات، امور مملکت و سیاست، اخلاق تہذیب و تمدّن غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں دخل اندازی کا حق حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے جبکہ باقی انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں۔

"اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ"

"نبیؐ تو مؤمنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں۔" (الاحزاب ۶)

جب رسولؐ اپنی صوابدید کے مطابق اور حکم الٰہی کے تحت کوئی فیصلہ فرماتا ہے تو کسی کو اس پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ"

"اور نہ کسی ایمان دار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایمان دار عورت کو کہ جب خدا اور اس کا رسولؐ کسی کام کا حکم دیں تو انہیں اپنے اس کام (کے کرنے نہ کرنے) کا اختیار ہو۔" (الاحزاب ۳۶).

رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد مذکورہ "ولایتِ تشریعی" (حق اعتباری) خدا کے حکم سے آپ کے جانشینوں اور خلفاء معصومینؑ میں منتقل ہوگئی۔ علمائے شیعہ میں سے کسی کو اس بات سے اختلاف نہیں ہے کہ بارہ امامؑ رسول اکرمؐ کے جانشین ہیں سوائے ان چیزوں کے جو صرف رسول اکرمؐ سے مخصوص ہیں۔ یعنی نبوّت و رسالت اور بعض احکام۔

ولایتِ فقیہ

اب محل بحث یہ ہے کہ

- جب گیارہ ائمہؑ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور امام زمانہؑ پردہ غیبت میں ہیں تو مسلمانوں کا سرپرست اور حاکم واقعی کون ہوگا؟
- آیا فقہائے عظام اس منصب تشریعی پر فائز ہیں یا نہیں جن پر ائمہؑ فائز تھے؟
- اگر ہم فقہاء اور علماء کو ائمہ معصومینؑ کا نائب مانتے ہیں تو وہ کس چیز میں نائب اور خلیفہ ہیں؟
- آیا ان کی نیابت کا دائرہ محدود ہے یا اتنا ہی ہے جتنا ائمہؑ اور رسول اکرمؐ کیلئے تھا؟

یہ بحث ''ولایتِ فقیہ'' کے عنوان سے مشہور ہے۔

مختلف نظریات

اور اس سلسلے میں علماء کے درمیان تین قول پائے جاتے ہیں۔

(i) فقہاء کی ولایت کا دائرہ صرف قضاوت تک محدود ہے اور کسی قاضی کیلئے جو ولایت ثابت ہوتی ہے، فقہاء کی ولایت اسی سطح تک محدود ہے۔

(ii) فقہاء سے تمام اختیارات سلب کئے گئے ہیں سوائے دو کے ایک فتویٰ دینے اور دوسرا قضاوت کا اختیار، یعنی ترافع شخصی۔[1]

(iii) فقہاء ولایتِ عامہ کے مالک ہیں۔

---

[1] کسی متنازعہ معاملے کا فیصلہ کرنے کیلئے حاکم شرع کی طرف رجوع کرنا۔

ان تینوں اقوال کی تفصیل یہ ہے :

ا۔نظریہ اوّل کی تفصیل

فقہاء مسلمانوں کے صرف ذاتی معاملات میں دخیل ہو سکتے ہیں، سماجی و اجتماعی امور و معاملات میں ان کی دخل اندازی جائز اور درست نہیں ہے۔لہٰذا فقیہ جب فتویٰ دیتا ہے تو وہ صرف بیان احکام اور اپنی انفرادی حیثیت میں یہ کام انجام دیتا ہے اور اس حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس پر عمل کرتا ہے یا نہیں۔ یہ بات تو بہت واضح ہے۔

اس نظریہ کے مطابق قضاوت بھی مستثنیٰ قرار پائی تھی مگر تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قضاوت مطلقاً اور بلا شرط ثابت نہیں ہے۔ بلکہ فقیہ کو ایسے متنازع فریقین کے درمیان فیصلہ سنانے کا حق ،قطع (فیصلہ) دعویٰ اور نزاع کو حل کرنے کے اختیارات کا حاصل ہونا ثابت ہے جو اپنی مرضی سے اس کی طرف رجوع کریں اور اس سے مسائل دریافت کریں لہٰذا اگر وہ خود رجوع نہ کریں تو اس نظریہ کے مطابق فقیہ کے لئے از خود دخل اندازی کر کے فیصلہ کرنے کے کسی حق کا حاصل ہونا ثابت نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اسلامی معاشرہ میں بدعنوانیوں کے مرتکب اشخاص اور مجرموں کے خلاف حدود الٰہی (تعزیرات) کو جاری کرنے اور اس کو نافذ کرنے کے حق سے وہ محروم ہے، جس کے نتیجے میں فقیہ پر کوئی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی۔اس نظریئے کی رو سے اجتماعی امور میں ایک عام آدمی اور فقیہ کے لئے یکساں حکم ہے۔

حدود و تعزیرات کے نفاذ کے علاوہ ''امور حسبیہ'' [1] میں بھی فقیہ کو بحیثیت فقیہ دخل اندازی کی اجازت نہیں بلکہ وہ بحیثیت مؤمن و مسلمان دخل اندازی کر سکتا ہے۔
مثلاً:۔اموال یتیم ،اموال مجہول المالک۔

[1] وہ تمام انفرادی و اجتماعی امور وافعال جن کے ترک کرنے پر اللہ تعالیٰ راضی نہیں

چنانچہ اگر یتیموں کے اموال یا ان اموال میں جن کے مالک لا پتہ ہیں، دخل اندازی اور ان میں تصرّف کا مسئلہ درپیش ہو اور مجتہد اور اس کا وکیل موجود نہ ہو یا ان تک رسائی ممکن نہ ہو تو عام مؤمن و مسلمان بھی ان میں دخل اندازی کر سکتا ہے لیکن اگر فقیہ و مجتہد تک رسائی ممکن ہو تو انہیں زیادہ حقدار سمجھا جائے گا بلکہ اس صورت میں عام مؤمن کے لئے دخل اندازی کا حق ختم سمجھا جائے گا۔ مجتہد کو یہ اوّلیت و برتری **ولایتِ فقیہ** کے تحت حاصل نہیں بلکہ اس لئے حاصل ہے کہ وہ اسلامی قوانین کا ماہر اور باخبر شخص ہے اور دیگر مسلمانوں کی نسبت وہ شرعی موازین و احکام پر بہتر طریقے سے عمل کرنے کی اہلیّت رکھتا ہے چنانچہ ''امور حسبیہ'' میں فقیہ کی یہ مداخلت (قدر متیقّن) کی حیثیت رکھتی ہے، یعنی اگر فقیہ کی جگہ کوئی عام مسلمان یہ کام سرانجام دیتا تو خطا کا زیادہ احتمال تھا بنسبت فقیہ کے۔

بناء برایں ''امور حسبیہ'' میں عام مؤمن پر مجتہد و فقیہ کی برتری اوّلیت رکھتی ہے حاکمیّت نہیں۔ چنانچہ اس کے علاوہ دیگر شرعی امور میں فقیہ جامع الشرائط کو حاکمیّت کا حق حاصل نہیں، مثلاً رؤیتِ ہلال کے ثبوت کے لئے فقیہ فتویٰ تو دے سکتا ہے لیکن ''فتویٰ حاکمیّت'' یا حکم نہیں دے سکتا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''تنقیح العروۃ'' صفحہ ۴۱۴ تا ۴۲۴، مستند و کتاب صوم۔ آقائے نراقی

خلاصہ

حقوق دو قسم کے ہیں۔ (i) حقوق اللہ (ii) حقوق الناس (انفرادی و اجتماعی)

فقیہ کو صرف اور صرف انفرادی حقوق میں مداخلت کرنے کی اجازت ہے اور وہ حقوق اجتماعی و سیاسی اور حقوق اللہ میں مداخلت کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

۲۔ نظریہ دوم کی تفصیل

اس نظریہ کے مطابق فقیہ کی ولایت و حاکمیّت کے دائرہ اختیارات کو مزید وسیع کیا گیا ہے۔ چنانچہ عدلیہ (قضاوت) سے متعلق امور میں اسے فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

یعنی حکومت ائمہؑ کے دور میں ایک قاضی کو جو اختیارات حاصل تھے وہی اختیارات غیبت امام زمانہؑ میں فقیہ کو حاصل ہے۔ مثلاً:۔

(i) امور حسبیہ میں تصرّف کرنا۔

(ii) قاصر، سفیہ اور یتیم وغیرہ کے اموال کی حفاظت کرنا۔

(iii) مذکورہ اموال واملاک پر سرپرست (قیّم) کا تقرر کرنا۔

(iv) رؤیتِ ہلال کے ثبوت کا حکم دینا۔

(v) حدود وتعزیرات کا اجراء ونفاذ۔

لیکن وہ اجتماعی امور جو قضاوت سے متعلق نہیں، وہ فقیہ کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ مثلاً:۔

(i) امّتِ مسلمہ کی سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی رہبری کرنا۔

(ii) اسلامی حکومت کی تشکیل۔

(iii) ضرورت پڑنے پر جہاد کا حکم دینا۔

خلاصہ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہوا کہ فقیہ کے لئے دو چیزوں کا اختیار ثابت ہے۔

(i) فتویٰ دینا۔ (ii) قضاوت بطور مطلق اور تمام وہ امور جو قضاوت سے مربوط ہیں۔

۳۔ نظریہ سوم کی تفصیل

یہ نظریہ مذکورہ دونوں نظریات سے بالکل مختلف ہے۔ یعنی اس کے تحت مذکورہ دونوں نظریوں سے ثابت شدہ اختیارات کے علاوہ ولایتِ عامہ بھی فقیہ کے لئے ثابت ہے۔ چنانچہ مقام فتویٰ اور قضاوت کے ساتھ ساتھ ولایت اور مرجعیّتِ کلّ مسلمین بھی ثابت ہے۔ اس مرجعیّتِ کل میں سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور انتظامی امور بھی شامل ہیں۔

مختصر یہ کہ فقیہ عادل کے لئے ولایتِ عامہ اور مطلق زعامت یعنی مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق تمام امور کی نگرانی اور حل وفصل (متنازعہ امور میں فیصلہ کرنا) اسی طرح

ثابت ہے جس طرح رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے لئے ثابت تھی۔

مزید تشریح

ممکن ہے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہو جائے کہ نظریہ سوم کی رو سے رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کی ولایت کی مانند فقیہ کو بھی ولایت حاصل ہے اور اس طرح فقیہ اور ائمہؑ کے مقام کا مساوی ہونا لازم آتا ہے یا جس طرح ائمہ کو ولایتِ تکوینی حاصل تھی اسی طرح فقیہ کے لئے بھی ولایتِ تکوینی کا ثابت ہونا لازم آتا ہے۔

لیکن ایسی کوئی مساوات اور برابری وجود نہیں رکھتی۔ اس فاسد وہم وخیال کا جواب گزشتہ بحث میں موجود ہے لیکن اس کی مزید تشریح اور وہم وخیال کو دور کرنے کے لئے کچھ تفصیل بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

مزید تشریح کے لئے تین چیزوں کا ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہونا ضروری ہے۔

(i) ولایتِ تکوینی (ii) ولایتِ تشریعی (iii) اللہ تعالٰی کے نزدیک مقام ومنزلتِ ائمہ اطہارؑ۔

گو کہ کائناتی ولایت بنیادی طور پر صرف اللہ سے مخصوص ہے لیکن اس کی بعض اقسام رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کے لئے بھی ثابت ہیں نیز ''کائناتی'' اور ''اعتباری'' ولایت کے درمیان فرق ہے اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ جس کے لئے ولایتِ اعتباری ثابت ہو اس کے لئے ولایتِ تکوینی بھی ثابت ہو۔ با الفاظ دیگر ولایت تکوینی امت مسلمہ کی رہبری اور امامت کے فرائض سے مکمل طور پر الگ ہے۔

کائناتی ولایت ایک دوسری حقیقت ہے جس کی وجہ سے تمام ذرّاتِ عالم، صاحب ولایت کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور کائنات کا ہر ذرّہ ایٹم سے لے کر انجم تک اس کی اطاعت کے لئے تیار رہتا ہے۔ البتہ یہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔

یہ مذہب حقہ اثنا عشری کا مسلّمہ اصول ہے کہ اس مقام ولایت پر کوئی شخص فائز نہیں ہو

سکتا، اس لئے امامت اور رہبریٔ مسلمین، ولایتِ اعتباری کی ایک نوع ہے جو اللہ تعالیٰ نے (آگے بیان کی جانے والی نصوص، آیات وروایات کے مطابق) فقیہِ عادل کو عطا کی ہے اور فقیہ اس ولایتِ اعتباری کے ذریعے اپنے فریضے کو ادا کرسکتا ہے۔

فقیہ عادل کے فرائض میں حدود الٰہی کا اجراء، ظالموں سے مظلوموں کو ان کے حقوق واپس دلانا، دنیا بھر کے مظلوموں کی حمایت کرنا، مالیات کا جمع کرنا پھر انہیں مصارفِ شرعیہ میں خرچ کرنا اور اسلامی مملکت کی حدود کا دفاع کرنا شامل ہے، جس طرح رسول اکرمؐ کے دور میں آپؐ پر اور ائمہ معصومینؑ کے دور میں ان پر یہ فرائض عائد ہوتے تھے۔

لہٰذا مذکورہ امور کی اہمیت کے پیش نظر مجری (شرعی احکام کو نافذ کرنے والا) کے متعدد ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یعنی یہ احکام جب اپنے زمانے کی ضرورت اور افادیّت کے پیش نظر جاری کئے گئے تھے اور آج کے سائنسی، فکری اور تہذیبی طور پر ترقی یافتہ زمانے میں جبکہ یہ فقیہ عادل کے ذریعے سے نافذ کئے جارہے ہیں، ان کی افادیّت اور غرض وغایت میں زمانے کے اس اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ معاشرے کی وضعیّت کے اعتبار سے مذکورہ امور کا اجراء دور رسول اکرمؐ اور عہد ائمہ طاہرینؑ میں مناسب بلکہ ضروری تو تھا لیکن فقیہ عادل کے اس موجودہ دور میں معاشرے کی نمایاں تبدیلی کے سبب اب ان کے اجراء اور نفاذ کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ ہر عاقل جانتا ہے کہ موجودہ دور میں مذکورہ امور کا اجراء عہد رسول اکرمؐ سے زیادہ ضروری نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے، بناء بر ایں فقیہ عادل کے لئے احکام خداوندی کے اجراء کیلئے صرف اعتباری (ولایتِ تشریعی) ثابت ہے۔

اسی طرح ولایتِ اعتباری کے ثبوت سے یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ فقیہ کو بھی وہی مقام حاصل ہے جو معصومینؑ کو حاصل تھا، کیونکہ زیر نظر کتاب کا موضوع، ہر لحاظ سے مقام ومنزلت اور عظمت کے اثبات کا نہیں بلکہ رہبر (فقیہ) کی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داریوں اور

فرائض سے متعلق ہے۔اس ولایت کے ذریعے فقیہ کے کاندھوں پر ایک سنگین بوجھ ڈالا گیا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کی ہدایت اور رہبری کی ذمہ داری سنبھال لے۔

ولایتِ اعتباری کے اثبات کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ فقیہ کو قرب ومنزلت کے ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا جائے جو ایک عام انسان کے مقام سے بڑھ کر ہو۔اسے ہرگز یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جیسا کہ روایات کے مطابق یہ مقام رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے لئے مخصوص ہے، یہ مقام نہ ان سے پہلے کبھی کوئی حاصل کرسکا اور نہ ان کے بعد کوئی حاصل کرسکتا ہے۔جیسا کہ رسول اکرمؐ کے متعلق جبرئیلؑ نے فرمایا:۔لو دنوت انملة لاحترقت اگر ایک ذرہ بھی آگے بڑھا تو میں جل جاؤں گا۔

ائمہ طاہرینؑ سے مروی ہے:۔"ان لنا مع اللّٰه حالات لا یسعها ملک مقرّب و لا نبیّ مرسل" "بے شک اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے کچھ مخصوص حالات (روابط) ہیں جن کا متحمل کوئی مقرب فرشتہ ہوسکتا ہے اور نہ کوئی نبی مرسل۔"

بہر حال فقیہ (جامع الشرائط) کے لئے وہی ولایت (سرپرستی) ثابت ہے جو ائمہ طاہرینؑ کے لئے ثابت تھی۔البتہ اختیارات کی حدود کے لحاظ سے ایک نمایاں فرق ہے وہ یہ کہ ائمہ طاہرینؑ کی ولایت مطلقہ اور ہمہ گیر تھی،ان کی ولایت کے دائرہ سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہے،لیکن فقیہ جامع الشرائط کے اختیارات میں یہ خصوصیت نہیں ہے کہ ان کی ولایت دیگر فقہاء پر لاگو ہو،یعنی اگر ایک ہی دور میں ایک سے زیادہ فقیہ جامع الشرائط موجود ہیں تو ہر ایک کی الگ الگ ولایت اور نیابت امام زمانہؑ بطور مستقل ثابت ہے،لہٰذا ایک فقیہ دوسرے فقیہ کو ان کے منصب سے معزول یا منصوب کرنے کا حق نہیں رکھتا،کیونکہ ہر ایک کی صلاحیت اور مرجعیّت کی اہلیّت دوسرے کے برابر ہے اس موضوع کی مزید تشریح آئندہ بیان کریں گے۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں "ولایتِ فقیہ" کی حدود اور اس کے اختیارات وہی ہیں جو رسول اکرمؐ اور ائمہ طاہرین کے لئے ثابت ہے۔

(مزید اضافہ)

ولایتِ فقیہ کی بحث کے مختلف زاویے

ولایتِ فقیہ کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ مسئلہ ولایتِ فقیہ کلامی اور عقائدی مسئلہ ہے یا فقہی اور فروعِ دین سے مربوط ہے؟

جواب:

اس کا جواب مذہب اہل بیتؑ کے مطابق بالکل واضح ہے کیونکہ عصرِ غیبت میں ''ولایتِ فقیہ'' معصوم اماموں کی ولایت یعنی نظریہ امامت کا تسلسل ہے جس طرح معصوم اماموںؑ کی ولایت، رسولِ اکرمؐ کی ولایت کا امتداد واستمرار اور اہداف انبیاء کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن ولایتِ فقیہ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ فقہ کے مختلف ابواب میں اس کا تذکرہ ضرور آتا ہے اور بعض فقہی مسائل ولایتِ فقیہ کے بغیر قابل حل نہیں ہے۔ لہذا کتبِ فقہ میں اس پر بحث کی گئی ہے اگرچہ اس بحث کی جگہ علم کلام ہی کیوں نہ ہو۔ بہرحال اپنے قارئین کی آسانی اور ولایتِ فقیہ کے مفہوم کی مزید وضاحت وتشریح کے لئے اس موضوع سے متعلق بحث واستدلال کے مختلف زاویے اور طریقوں کا ذکر کرتے ہیں اور ہر زاویہ سے اس کا اثبات کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ عقائدی وکلامی۔

۲۔ فقہی۔

۳۔ اجتماعی۔

مذکورہ تمام زاویوں سے عقل ونقل کی روشنی میں ولایتِ فقیہ پر بحث اور استدلال کیا جاسکتا ہے اور قابل اثبات بھی ہے۔

پہلا زاویہ: عقائد وکلام

علم کلام میں بعثتِ انبیاء کے ضروری ہونے کو ثابت کرنے کے لئے کافی عقلی ونقلی دلائل پائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور لطفِ الٰہی کے عین مطابق ہے کہ انسان کی تخلیق کے بعد اس کی ہدایت ورہبری اور اس کی سعادت ونجات کے اسباب وذرائع بھی مہیا کرے چنانچہ ان اسباب میں انبیاء کی بعثت اور وقتاً فوقتاً آسمانی کتب کا انزال قطعاً شامل ہے چنانچہ ختم نبوت کے نظریے کے بعد نظریہ امامت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت ورہبری کے لئے اور اسلامی نظام چلانے کی خاطر حکومت کی تشکیل کی ضرورت کے فلسفے کی روشنی میں امامت کا سلسلہ جاری کیا تا کہ مذکورہ بالا ''قاعدۂ لطف اور قانون ''حکمتِ الٰہی'' کا مکمل ظہور ہو، نظریہ ولایتِ فقیہ پر وہ تمام عقلی ونقلی دلائل قابل تطبیق ہیں جو وجوبِ بعثتِ انبیاء اور رسول اسلام کے بعد وجوبِ نصبِ امام پر قائم کئے گئے ہیں۔ از جملہ (دلیلِ لطف وقاعدہ حکمت)

وضاحت

اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں سنہ ۱۱ھ میں رسولِ اسلام کی رحلت کے ساتھ ختم نبوت بھی ہوا اور رسالت کا متبادل قیادت کے طور پر امامت کا سلسہ جاری ہوا جو کہ سنہ ۲۶۵ھ سے غیبت صغریٰ کا آغاز ہوا اور امام زمانہؑ تک رسائی یعنی ان کی براہ راست ہدایت وقیادت سے استفادہ کرنے کے مواقع بہت ہی محدود ہوگئے اور یہ حالت ''غیبت صغریٰ'' تقریباً ۳۳۰ھ تک جاری رہی پھر غیبت کبریٰ شروع ہوا اور آج تک جاری ہے اور اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''جو اپنے بندوں پر مہربان اور لطف وحکمت کا سرچشمہ ہے'' غیبت کبریٰ میں لوگوں کی ہدایت وقیادت کے لئے کیا انتظام کیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ نظریاتی اور عقائدی حوالہ سے ''قاعدۂ لطف'' اور ''نظام حکمت'' ہر زمان ومکان میں بلاتفریق جاری وساری ہے اور انسان بحیثیتِ انسان دو چیزوں کا محتاج رہا ہے اور

رہے گا۔

۱۔قانون۔

۲۔قائد۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی سرپرستی اور اعلیٰ قیادت ایک اسلام شناس اور باصلاحت فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے اگر معصوم قیادت موجود ہو(رسول یا امام) تو یہ قیادت اس کے پاس ہوگی اور اگر معصوم قیادت میسر نہ ہو تو صفات و شرائط کے حوالے سے اس فرد کے ذمہ ہوگی جو سب سے زیادہ معصوم قیادت سے نزدیک ہو(الاقرب فالاقرب) اللہ تعالیٰ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرمایا:

"إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ٥"

"یقیناً ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریب ان کے پیرو ہیں اور پھر یہ پیغمبر اور صاحبانِ ایمان ہیں اور اللہ صاحبانِ ایمان کا سرپرست ہے۔"

(آل عمران۔٦٨)

قیادت معصوم سے نزدیک فقہائے عظام ہیں جو علم، صلاحیت اور عدالت میں دوسرے تمام افراد بشر سے شائستہ ہیں یہ نظریہ دراصل اس بات کو قبول کرنے کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے مطابق تشکیل حکومت کا اصلی فلسفہ الٰہی اقدار، اسلامی نظام اور عدل وانصاف کو معاشرے میں رائج ونافذ کرنا ہے۔

فقہی زاویہ

فقہی زاویہ سے ہم اصل کتاب ولایت فقیہ میں عقلی، قرآنی اور روایات کی روشنی میں بحث کر چکے ہیں اور اختصار کی خاطر مزید دلائل پیش کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

اجتماعی زاویہ

انسان طبعی طور پر اجتماع پسند ہے اور کوئی بھی انسان دوسرے افراد سے الگ تھلگ رہ کر زندگی کے معاملات نہیں چلا سکتا بلکہ بنی نوع انسان کے دوسرے افراد سے مل جل کر انفرادی اور اجتماعی معاملات، مسائل اور ضروریات حل کر سکتا ہے اور آپس میں ایک اجتماعی تفاہم، تعاون، احترامِ متبادل، دوسرے افراد کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوں۔ اپنے حقوق کا حصول اور اس کا دفاع وغیرہ وغیرہ۔۔۔ کچھ ایسے مشترکہ اصول ہیں جن کے بغیر نہ امن قائم ہوگا نہ زندگی بسر کرنا ممکن ہے مطالب بالا کے حصول کی دو بنیادی شرائط درکار ہیں۔

ا۔ حکومت۔

۲۔ نظام و قانون۔

کیونکہ کسی بھی ملک یا معاشرے کا وجود یا بقاء حکومت کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ صرف حکومت ہو مگر قانون کے بغیر ہو تو وہ جنگل میں تبدیل ہو جائے گا۔

ا۔ ضرورتِ حکومت

ہر دور میں کوئی نہ کوئی حکومت کا ہونا ضروری ہے تاکہ افراتفری اور ہرج مرج پیدا نہ ہو اور امن عامہ، جان و مال اور ناموس محفوظ رہ سکیں اسلام اور عقل کی نگاہ میں حکومت کے قیام کی ضرورت پر کوئی شبہ نہیں پایا جاتا اب سوال یہ ہے کہ غیبت کبریٰ میں حکومت کون چلا سکتا ہے؟ یعنی مسلمانوں کا حاکم کون ہوگا؟

ا۔ ایک فرض یہ ہے کہ حکومت جائرہ اور ظالم کی اطاعت ہو مگر یہ فرض تعلیمات قرآن وسنت مطہرہ کی سو فیصد خلاف ورزی ہے۔

۲۔ دوسرا احتمال، عدولِ مومنین کے ذریعے اگر عادل مومنین کی حکومت قابل قبول ہے تو فقیہ عادل جامع الشرائط کی حکومت ''ولایت'' بطریق اولیٰ قابل قبول ہے۔ چنانچہ بعض فقہاء

باب حسبہ کے حوالے سے ولایت فقیہ کے قائل ہیں۔

۲۔نظام

دوسری بنیادی شرط ایک جامع وہمہ گیر نظام حکومت ہے جس کے نفاذ سے عدل و انصاف اور حقوق فردی واجتماعی کا تحفظ اور پر امن زندگی میسر آسکتی ہے اسلام کے نقطہ نگاہ سے اسلامی نظام کے علاوہ کوئی اور نظام مذکورہ اوصاف سے متصف نہیں ہے اب سوال یہ ہے اسلامی نظام چلانے کی اہلیت وقابلیت کون رکھتا ہے؟ لامحالہ اس صلاحیت کا مالک صرف اور صرف ''فقیہ جامع الشرائط'' ہی ہوسکتا ہے چنانچہ زمان حضور معصوم (مثلاً امیر المومنینؑ کے عہدِ خلافت) میں مرکز کے علاوہ باقی شہروں میں امام معصوم کے نمائندے حاکم تھے اور اسلامی نظام نافذ کرتے تھے زمان غیبت میں بھی یہی نظام نیابت جاری ہوسکتا ہے۔

ولایتِ فقیہ کے اثبات کے لئے مندرجہ بالا تین زاویوں کے علاوہ مندرجہ ذیل طریقوں سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔

ا۔اسلامی نظام کی بقاو جاویدانی۔

۲۔بابِ حسبہ۔

۳۔عدل وانصاف کی نشرواشاعت کی ضرورت۔مگر ہم بوجہ اختصار مذکورہ وجوہات کے ذکر سے گریز کرتے ہیں۔

ولایتِ فقیہ عقل کی روشنی میں

ولایتِ فقیہ کے ثبوت کے لئے وہی عقلی دلیل قائم ہے جو حضور اکرمؐ کے بعد ضرورت امامؑ کے موضوع پر قائم کی گئی تھی اس دور میں بھی وہی ضرورت باقی ہے جو رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد موجود تھی۔

اس عقلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا جانشین ایسا شخص ہو سکتا ہے جو تمام صفات میں ان کا ہم پلّہ ہو، ایسا ممکن نہ ہونے کی صورت میں ایسا فرد اسلامی حکومت کا سربراہ اور اسلامی احکام کا مفسر و مبیّن بننے کا اہل ہے جو باقی مسلمانوں سے علم، شجاعت اور دیگر صفات میں افضل ہو تا کہ اسلامی قانون کے نفاذ میں علمی اور عملی دشواری پیش نہ آئے۔ اس دلیل کا مزید بیان کرنا فی الحال موضوع بحث سے خارج ہے اس لئے اس کی مزید تشریح کے طالبین مفصّل کتب کی جانب رجوع فرمائیں۔

اسی طرح فقیہ جامع الشرائط، دورِ غیبت کبریٰ امام زمانؑ میں واحد ایسی شخصیت ہے جو باقی تمام مسلمانوں کی نسبت امام زمانہؑ اور ائمہ معصومینؑ سے زیادہ قریب ہے کیونکہ فقیہ میں جو علم شریعت پایا جاتا ہے وہ باقی مسلمانوں میں عام طور پر نہیں پایا جاتا، لہٰذا ان میں عدالت اور قیادت کی صلاحیت کا بدرجہ اتم موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

دورحاضر میں نفاذِ اسلام

اس مقام پر ایک بنیادی سوال سامنے آتا ہے کہ کیا موجودہ دور میں سابقہ ادوار کی طرح اسلام کا نفاذ ضروری ہے یا نہیں؟ جواب نفی میں ہونے کی صورت میں اس کی وجہ درج ذیل وجوہات میں سے ایک ہوسکتی ہے۔

ا۔اسلام کی منسوخی

یعنی اسلام کی مدت نفاذ محدود تھی اور یہ صرف ایک مخصوص مدت کے لئے آیا تھا اور یہ مدت گزرجانے کے بعد گزشتہ آسمانی شریعتوں کی مانند یہ بھی منسوخ ہوگیا اس لئے اس وقت اسلام کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔مجری کا فقدان

اسلام کے نفاذ کی ضرورت نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسلام بذات خودتو دائمی اور قیامت تک کے لئے ہے لیکن اس میں ایک بنیادی عنصر کم ہے جس کی وجہ سے اسلام اس وقت قابل نفاذ نہیں رہا، اور وہ عنصر یہ ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا اشارہ یا نص موجود نہیں ہے جو عصر معصومینؑ کے بعد اس کے مجری کا تعین کرے اور اسلام بذات خود اس پہلو کے بیان پر خاموش ہے لہٰذا کسی پر اس کے نفاذ کے ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

وجوہات کا جواب

مذکورہ دونوں وجوہات اسلام کے نقطہ نگاہ سے بالکل غلط ہیں اسلام کبھی منسوخ ہوا ہے اور نہ کبھی منسوخ ہوگا۔

اسی طرح اسلام میں کوئی خامی بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کے نفاذ میں رکاوٹ پیدا ہو۔

اسلام کو نافذ کرنے والا لازمی وضروری عنصر اس میں ہمیں ہر وقت دکھائی دیتا ہے۔ یہ عنصر اسلام میں ہر وقت موجود تھا اور اب بھی موجود ہے۔

چنانچہ رسول اکرمؐ کے بعد اپنے نفاذ و اجراء کا بندوبست اور اپنی تشریح و بیان کا انتظام خود اسلام نے کیا۔ اسی طرح معصومینؑ کے زمانے کے بعد کے لئے بھی مذکورہ انتظام خود اسلام نے کیا ہے، کبھی اسلام کے اجراء کرنے والے کا تعین معصومؑ کی شکل میں ہوا اور کبھی نائب معصوم کی شکل میں۔

اگر واقعی اسلام میں اسے جاری کرنے والا عنصر نہ ہوتا تو اس کے تباہ اور فنا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

اس کے علاوہ اس عنصر کے نہ ہونے کا تصور بھی اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب ایک طرف اسلام کے دائمی ہونے کا دعویٰ ہو اور دوسری جانب اس کو نافذ کرنے کا کوئی طریقہ کار موجود نہ ہو۔ درحقیقت یہ ایک قسم کا تضاد ہے جو عقل کی نگاہ میں محال نظر آتا ہے۔

دینِ اسلام قابل نفاذ ہے

مذکورہ فرضی نظریہ کے بالمقابل ایک اور نظریہ موجود ہے جس سے اسلام کے اجراء اور نفاذ کی ضرورت کا مثبت جواب ملتا ہے اور جو اسلامی احکام کی تنفیذ اور اس کے لابدّی [ضروری] ہونے کا قائل ہے لیکن اس کے نفاذ و اجراء کی کئی صورتیں ہیں، وقت کے تقاضوں کے مطابق ان میں سے ایک کا ہم انتخاب کر سکتے ہیں۔

ا۔ موجودہ مسلمان حکمرانوں کے ذریعے

یہ صورت قابل عمل نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ حکمران (جو اسلامی احکام کے پابند نہیں ہیں) بحکم قرآن ظالم وجابر اور فاسق ہیں۔ ان پر بھروسہ کرنے سے قرآن نے منع کیا ہے۔

''وَلَاتَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ''

''اور (مسلمانو) جن لوگوں نے (ہماری نافرمانی کر کے) اپنے اوپر ظلم کیا ہے ان کی طرف مائل نہ ہونا ورنہ تم تک بھی (دوزخ کی) آگ آ لپٹے گی۔'' (ھود ۱۱۳)

۲۔شوریٰ بین المسلمین کے ذریعے

شوریٰ اگرچہ اصولی طور پر اسلام میں ثابت تو ہے، مگر اس میں بھی ایک ضروری عنصر کی کمی ہے۔ وہ ہے شرائط شوریٰ۔

مثلاً اسلام میں شوریٰ کا جہاں جہاں ذکر ہوا ہے وہاں شوری کے ارکان کی شرائط نہیں بیان کی گئیں۔ آیا تمام مسلمان شوریٰ کے ارکان ہیں؟ یا ان کا ایک گروہ؟ اور وہ گروہ کون سا ہے؟ عادل مؤمنین، علمائے اسلام، وکلاء یا دانشوران؟ اس لئے یہ صورت بھی قابل قبول نہیں ہے۔

۳۔مسلمانوں کا ایک مخصوص گروہ عادل مومنین یا وکلاء کے ذریعے

عادل مومنین اگرچہ بعض ضروری کام انجام دے سکتے ہیں لیکن وہ ایک اسلامی حکومت چلانے یا پورے اسلام کو نافذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، کیونکہ وہ اسلام سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہوتے۔

یہی حال وکلاء کا ہے۔ وکلاء حضرات قانون دان تو ہیں مگر اسلام شناس نہیں۔ جو اسلام سے واقف وآشنا نہ ہو وہ اسے کس طرح نافذ کر سکتا ہے؟

۴۔علماء کے ذریعے

اسلام کے نفاذ کی ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ ہے علمائے اسلام اور اسلام شناس

حضرات کے ذریعے اسلام کو نافذ کیا جائے، کیونکہ وہ اسلام کے احکام و اسرار سے واقف ہیں اور اسی صورت کا نام **ولایتِ فقیہ** ہے۔

علمائے اسلام کے ذریعے اسلام کا نفاذ نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس طرح اسلام سے انحراف اور کج روی کا راستہ اختیار نہ کرنے کی ضمانت بھی ملتی ہے۔

ولایتِ فقیہ قرآن کی روشنی میں

اسلامی حکومت کا سربراہ فقیہ ہونے کی ضرورت، خود اسلامی حکومت کی منفرد نوعیت مشترکہ عمومی ہدف اوراس کے اعلیٰ مقاصد سے عیاں ہوتی ہے۔

اسلامی حکومت کا مقصد مسلمانوں کو صرف مادہ اور مادہ پرستی میں منحصر کرنا یا صرف روحانی پہلو میں بند کر کے حلال اور جائز مادی لذتوں سے محروم کرنا نہیں بلکہ اس کے پیش نظر روحانی ارتقاء اور مقصد خلقت کی جانب انسان کو گامزن کرنے کے لئے مادی امور کو مقدمہ اور تمہید کے طور پر استعمال کرنا ہے۔

مذکورہ مقصد کی تکمیل کے لئے ایک ایسے رہبر کی رہبری کی ضرورت ہے جو خود اس معیار اور پیمانہ کا اعلیٰ نمونہ ہو۔

دوسری طرف اسلام کا نظام، انسان کا خودساختہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام ہیں جو قرآن کریم، شریعتِ محمدؐیہ اور آپؐ کی آلؑ کی بیان کردہ احادیث کی شکل میں موجود ہیں اور جن کا سمجھنا ہر انسان کے بس میں نہیں ہے۔

احکام الٰہیہ کا استنباط صرف ایسے چندافراد کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا احکام کو سمجھنا قرار دیا ہو اور احکام کو سمجھنے میں مکمّل مہارت رکھتے ہوں۔

قرآن کریم کے نزدیک حکومتِ اسلامی کے سربراہ کی شرائط کیا ہیں؟ آیا ہر شخص کو حاکم تصور کیا جانا درست ہے؟

اسلامی حکومت کی سربراہی کیلئے قرآن کریم چند شرائط لازمی قرار دیتا ہے۔

ا۔ایمان وتقویٰ

قرآن کریم کی متعدد آیات پر تحقیق کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے مربوط کرنے سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص حاکم اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس حاکم اعلیٰ کیلئے باایمان، متقی، باعمل، اہل علم اور صاحب بصیرت ہونا ضروری ہے۔

''یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ''

''جولوگ تم میں سے ایماندار ہیں اور جن کو علم عطا ہوا ہے خدا انکے درجے بلند کرے گا۔''(مجادلہ ۱۱)

''هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَایَعْلَمُوْنَ

''بھلا کہیں جاننے والے اور نہ جاننے والے لوگ برابر ہو سکتے ہیں۔''(الزمر ۹)

''اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ''

''کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سقائی اور مسجد الحرام (خانہ کعبہ) کی آبادی کو اس شخص کے ہمسر بنادیا ہے جو خدا اور روزِ آخرت پر ایمان لایا۔''(توبہ ۱۹)

پہلی آیت کی روشنی میں قرب ومنزلت اور درجات میں بلندی کا معیار ایمان اور علم کو قرار دیا گیا ہے۔واضح ہے کہ جو شخص اسلامی معیار کے مطابق اللہ کے نزدیک کسی خاص مقام اور درجے کا حامل ہوگا تو وہ شخص باقی افراد سے زیادہ قابل اتباع ہوگا۔ نیز ایسے شخص کی ہدایات اور رہبری میں روحانی لحاظ سے ایک ایسا سکون واطمینان بھی بندگانِ خدا کو حاصل ہوتا ہے جو دوسروں سے حاصل نہیں ہوتا۔

''اَفَمَنْ یَهْدِیْ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْ اِلَّا اَنْ یُّهْدٰی فَمَالَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ''

''جو شخص دینِ حق کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے (حکم کی) پیروی کی جائے یا وہ شخص جو (دوسرے کی ہدایت تو درکنار) خود ہی جب تک دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے وہ راہ دیکھ نہیں پاتا، تو تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟۔'' (یونس ۳۵)

ایسا شخص مضبوط ایمان سے مالا مال ہوتا ہے اور اس کے ایمان کی بنیاد علم و معرفت اور فہم و فراست پر ہوتی ہے، اس لئے یہ ایمان غیر متزلزل اور مضبوط ثابت ہوتا ہے۔

''المؤمن کالجبل لا تحرکه العواصف ولا تزیله القواصف ''

''مومن پہاڑ کی طرح (مضبوط) ہوتا ہے، جسے نہ آندھی ہلا سکتی ہے نہ طوفان سے اس میں تزلزل آسکتا ہے۔''

ایسے فرد کا ایمان بذات خود مضبوط اور غیر متزلزل ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر مقتدیوں کی رہنمائی کا بھی باعث بنتا ہے، یعنی ایسا شخص دوسروں کے لئے اسلامی احکام اور فرامین کا ایک عملی نمونہ بن کر نمایاں ہوتا ہے۔ اس قوی الایمان شخص سے ملت اسلامیہ کو یہ اطمینان اور قلبی سکون میسر آتا ہے کہ یہ امت اسلامیہ کے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی مفادات پر کبھی سودا بازی نہیں کرے گا اور کبھی بھی ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا، بلکہ اسے ہر متوقع اور ممکنہ خطراتِ مفاسد اور بدعنوانیوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ کیونکہ یہ اس کے قوی ایمان کا تقاضا اور اسلامی اصول کے مطابق فریضہ بھی ہے۔

اس کے برعکس اگر کوئی گمنام، غیر معتبر، ناقابل اعتبار، مفاد پرست، ہواو ہوس کا دلدادہ، لالچی، کینہ پرور اور شہرت طلب شخص حاکمِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو جائے تو ان دونوں

میں سے کون لائق اور سزاوار پیروی ہے؟

''اَفَمَنْ یَهْدِیْ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْ اِلَّا اَنْ یُّهْدٰی فَمَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ.''

''جو شخص دین حق کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے (حکم کی) پیروی کی جائے یا وہ شخص جو (دوسرے کی ہدایت تو درکنار) خود ہی جب تک دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے وہ راہ دیکھ نہیں پاتا، تو تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟'' (یونس ۳۵)

اس آیہ شریفہ میں ان دو افراد کے درمیان تقابل کیا گیا ہے۔

ا۔ وہ جو دوسروں کو ہدایت کرنا تو درکنار خود محتاج ہدایت ہے۔

۲۔ وہ شخص جو ہدایت یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی ہدایت کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

ان دونوں کو ایک ہی قطار میں کھڑا کرنا غیر منطقی عمل ہے، کیونکہ جو شخص خود ہدایت یافتہ نہیں ہے یا خود ہدایت یافتہ اور نیک تو ہے لیکن دوسروں کو ہدایت دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو وہ ملت اسلامیہ کو کیا دے سکتا ہے؟

اسی سے دوسرا پہلو روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ جب ایسے افراد کے درمیاں تقابل کیا جائے جن میں سے ایک ہادی امت اور رہبری کے تمام اوصاف اور شرائط کا مالک ہے اور دوسرا بذات خود جاہل اور بدعنوان ہو، جیسا کہ موجودہ دور میں عموما ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم جہالت و نادانی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ فرعونیت اور شہنشاہیت کے نشے میں مست ہیں۔ تو ان میں سے کون ہادی ور رہبر بننے کا اہل ہوگا؟

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ خداوند عالم کے نزدیک وہی لوگ محترم و مکرم ہوتے ہیں جو ایمان اور تقویٰ خداوندی سے معمور ہوں۔

''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ.''

''اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے
جو بڑا پرہیزگار ہے۔'' (الحجرات ۱۳)

قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم، خاص توفیق اور تائید مومنین کے شامل حال ہوتی ہے اس بارے میں چند آیات ملاحظہ فرمائیں:۔

''اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ آمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی''

''وہ چند جوان تھے کہ اپنے (سچے) پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم
نے ان کی سوچ، سمجھ اور زیادہ کردی۔'' (کہف ۱۳)

''وَیَزِیْدُاللّٰہُ الَّذِیْنَ اھْتَدَوْا ھُدًی.''

''اور جو لوگ راہ راست پر ہیں خدا ان کی ہدایت اور زیادہ کرتا جاتا ہے۔
(مریم ۷۶)

''وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی وَّآتَاھُمْ تَقْوٰھُمْ.''

''اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا (قرآن کے ذریعے سے) مزید
ہدایت کرتا ہے اور انکو پرہیزگاری عطا کرتا ہے۔'' (محمد ۱۷)

مردمومن کا قوی ایمان اس کا باعث بنتا ہے کہ خداوند عالم اس کو مزید توفیق عطا فرمائے اور ایمان کے نئے مراحل طے کرنے کے لئے اس کی خاص طور پر رہنمائی فرمائے اور اس طرح اس کا ہر پہلا قدم، دوسرا قدم اٹھانے کے لئے مدومعاون بن جاتا ہے جیسا کہ ارشاد خداوند عالم ہے:

''وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجاً.''

'اور جو خدا سے ڈرے گا تو اس کے لئے نجات کی صورت نکال دے

گا۔'' (الطلاق. ۲)

متقی کے سامنے ہر قسم کے مسائل کا صحیح طور پر حل موجود اور واضح ہوتا ہے اور وعدہ خداوندی کے مطابق حق اور باطل کے درمیان خصوصی طور پر اس کے پاس میزان اور معیار ہوتا ہے، اگر چہ وہ خود عادی اصول کے مطابق اس معنوی رزق کے سرچشمہ اور کیفیت سے نا آشنا ہوتا ہے مگر وہ غیر متوقع طور پر اس سے سرشار رہتا ہے، توفیق وعنایتِ الٰہی اس کے شامل حال ہوتی رہتی ہے اور یہ شخص قرآن کے الفاظ میں بندہ صالح بھی ہے۔

اللہ تعالٰی نے اس کے ساتھ یہ وعدہ بھی کر رکھا ہے کہ وہ اس کو زمین کا وارث بنائے گا۔

''وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ''

''(اے ایماندارو!) تم میں سے جن لوگوں نے ایمان لایا اور اچھے اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں (ایک نہ ایک دن) روئے زمین پر ضرور (اپنا) نائب مقرر کرے گا جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔'' (نور. ۵۵)

''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ.''

''اور ہم نے تو نصیحت (توریت) کے بعد یقیناً زبور میں لکھ ہی دیا تھا کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔'' (الانبیآء ۱۰۵)

اس لئے ایک متقی اور باایمان کی بجائے ایک ایسے شخص کو کس طرح منتخب کیا جا سکتا ہے جس کا ایمان اور تقویٰ کمزور ہو یا سرے سے ہی نہ ہو، اور ایسے شخص پر ملت اسلامیہ کا اعتماد کس طرح قائم ہو سکتا ہے جس میں اپنے نفس پر اعتماد کرنے کے لئے سرمایہ (ایمان) موجود نہ ہو۔

خلاصہ

اسلامی حکومت کے حاکمِ اعلیٰ کی پہلی شرط ''ایمان اور تقویٰ'' کا خلاصہ یہ ہوا۔

(i) خداوند عالم کے مشرع ہونے پر ایمان رکھتا ہو، یعنی وہ اس عقیدے کا مالک ہو کہ بنی نوعِ انسان کی تنظیم زندگی کے لئے قانون بنانے والا خدا ہی ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ خالق بھی ہے۔

(ii) اس کا ایمان ہو کہ اسلام کا قانون ایک ہمہ گیر اور جاویداں نظام ہے۔

(iii) اپنے نفس پر ایمان ہو، یعنی ایک اسلامی فریضہ سمجھ کر اسلامی قوانین نافذ کرنے اور اس کے لئے عملی اقدام کرنے کی ضرورت کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی صلاحیت وقابلیت پر بھی بھروسہ ہو۔

۲۔ علم

قرآن کریم میں علم کی برتری اور اس کا بلند مقام نہایت واضح ہے۔

''هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ.''

''بھلا کہیں جاننے والے اور نہ جاننے والے لوگ برابر ہو سکتے ہیں۔'' (الزمر ۹)

''يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ.''

''جو لوگ تم میں سے ایماندار ہیں اور جن کو علم عطا ہوا ہے خدا انکے درجے بلند کرے گا۔'' (مجادله. ۱۱)

''وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِىْ بِأَسْمَآءِ هٰؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ○''

''اور (آدمؑ کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں (کہ ہم مستحق خلافت ہیں) سچّے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ (تب فرشتوں نے عاجزی سے) عرض کی تو (ہر عیب سے) پاک ہے ہم تو جو کچھ تو نے بتایا ہے اس کے سوا نہیں جانتے۔'' (البقرۃ۔۳۱،۳۲)

''اَفَمَنۡ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ وَیَتۡلُوۡہُ شَاھِدٌ مِّنۡہُ ''

'تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن پر ہو اور اس کے پیچھے انہی کا ایک گواہ ہو۔'' (ھود ۱۷)

دوسری طرف قانون اسلام پر عبور حاصل کرنے کی شرط بدیہیاتِ عقلی میں شمار کی جاتی ہے اور اس شرط کا پتہ اس مخصوص واقعہ سے بھی چلتا ہے جو بنی اسرائیل میں رونما ہوا۔

''وَزَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ''

''اور (مال میں نہ سہی) مگر علم اور جسم کا پھیلاؤ تو اسی خدا نے زیادہ فرمایا ہے۔'' (البقرۃ ۲۴۷)

ہر اس چیز کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے جس کا تعلق قانون نافذ کرنے سے ہو اور اس شرط (علم) کے ساتھ ساتھ قدرت اور شجاعت کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ دشمنان اسلام اور کسی کی طعن و تشنیع اور ان کے خوف و ہراس کی پرواہ کئے بغیر وہ اپنے فریضے کی انجام دہی میں مصروف عمل رہے۔

چونکہ یہ شرط بذات خود واضح ہے اس لئے اس پر زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں ہے لہٰذا صرف دو نکات کا ذکر کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

(i) اسلامی قوانین کا علم۔

(ii) ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علمی دسترس حاصل ہونا۔

اس کی مزید تشریح فقیہ کی شرائط کے ضمن میں کی جائے گی۔

دوسری طرف اگر اسلام کے نقطہ نگاہ سے باصلاحیت افراد کی اطاعت لازم نہ ہوتو کیا غیر صالح افراد کی پیروی جائز ہوگی؟ جن میں ظالم اور منافق وغیرہ بھی شامل ہیں۔

آیا اسلام کے نزدیک بنی نوع انسان کی زندگی کو منظّم کرنے اور بقاءِ باہمی کے لئے حکومت کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ضرورت ہے تو کیا اس کا حاکم اعلیٰ ایک ناقص شخص ہونا چاہئے یا اس کے لئے معاشرے کے سب سے اعلیٰ اور کامل شخص کو منتخب کرنا چاہئے؟

ظاہر ہے اسلامی حکومت کی ضروریات پر زور بھی دینا اور کامل شخص کی موجودگی میں غیر کامل اور غیر صالح افراد کی پیروی بھی نہیں کرنی۔

اس لئے کامل اور لائق ترین شخص وہ ہے جو علم اور عمل دونوں اعتبار سے معاشرے کے تمام افراد سے نمایاں مقام پر فائز ہو۔ یہ شخص دوسرے لفظوں میں فقیہ جامع الشرائط ہی ہوسکتا ہے اور بس!

اس بحث کے خاتمہ پر ان چند روایات کا ذکر کرنا مناسب ہے جس سے حاکم اسلامی کی عمومی شرائط کا پتہ چلتا ہے۔

حکمران کے اوصاف روایات کی روشنی میں

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:۔

''ایھاالنّاس ! انّ احقّ النّاس بھٰذاالأمر اقواھم علیه و اعلم بأمر الله ''

''اے لوگو! بے شک وہی شخص اس امر (خلافت وحکومت) کا مستحق ہے جو سب سے زیادہ قدرت اور علم کا حامل ہو۔'' (نھج البلاغه خطبه۱۷۷ .الحیاة ج ۲، ص ۳۸۴)

"لا يصلح الحكم و لا الحدود و لا الجمعة الّا لأمام عدل."

"امام (رہبر) عادل کے بغیر (کسی سے بھی) حکم (حکومت) حدود (تعزیرات) اور جمعہ درست نہیں ہے۔" (دعائم الاسلام ج ۱/ص ۱۸۴، البحار بحواله الحياة ج ۲/ص ۳۸۴).

"اتقوا الله و اطيعوا امامكم فأن الرعيّة الصّالحة تنجوا بأمام العادل الّا و انّ الرّعيّة الفاجرة تهلك بالأمام الفاجر"

"اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور اپنے امام (رہبر) کی اطاعت کرو، بے شک صالح رعیت کی نجات امام عادل (کی اطاعت) میں مضمر ہے۔ آگاہ رہو کہ فاجر رعیت، فاجر امام کے سبب ہلاک ہوتی ہے۔" (البحار. ج۸/ص ۴۷۲، الحیاة. ج ۳۸۵/۲)

امام محمد باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔

"ان من دان الله بعباده يجتهد فيها نفسه بلا امام عادل من الله فأن سعيه غير مشكور و هو خال متحيّر"

"بے شک جو شخص اپنے نفس کو زحمت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ امام عادل کے بغیر عبادت کرے تو اس کی مساعی و کوشش قابل قبول نہیں اور وہ پریشان و گمراہ ہے۔" (المستدرک. ج ۱/ص ۸، الحیاة. ج ۲/ص ۳۹۶).

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا:۔

"و طاعة ولاة العدل تمام العزّ."

"اطاعتِ والیان عدل (عادل قائدین) مکمل عزت (کا باعث بنتی) ہے۔" (تحف العقول۔ ص ۲۸۷ بحوالہ الحیاۃ۔ ج ۲/ص ۳۸۵)۔

مذکورہ احادیث کے علاوہ اور بھی ہزاروں ایسی روایات ہیں جو کہ ہمارے دعویٰ پر شاہد ہیں۔

مذکورہ احادیث سے چند اصولی نکات واضح ہوتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کے حاکم یا رہبر و قائد کا عادل ہونا ضروری ہے۔

۲۔ عدالت کے علاوہ اسکے لئے مضبوط دل کا مالک اور بہادر ہونا بھی شرط ہے۔

۳۔ اس کیلئے لازمی ہے کہ وہ اسلامی عقائد اور موجودہ زمانے کے تقاضوں سے آگاہ ہو۔

۴۔ جابر حاکم کی قیادت میں کسی قسم کا عمل درست نہیں ہے۔

جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا أَطِیْعُوا اللّٰهَ وَأَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْکُمْ''

''اے ایمان دارو۔ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔'' (النساء ۵۹)

خدا اور رسول کی اطاعت کے فرض ہونے سے کوئی بھی مسلمان اختلاف نہیں کرسکتا اور ''اللہ'' اور ''رسول'' کا خارجی (ظاہری) مصداق بھی معیّن ہے۔ اگرچہ لفظ ''رسول'' (پیغام لانے والا) لغت کے لحاظ سے عام ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن اور اسلامی اصطلاح کے مطابق ایک شخص یعنی رسول اکرمؐ کیلئے ہی مخصوص نہیں بلکہ قرآن کی رو سے اس کا اطلاق سابقہ تمام انبیاء پر بھی ہوتا ہے لیکن مذکورہ آیت میں اس کا مصداق، تمام مفسّرین کے نزدیک رسول اسلامؐ ہیں اس لئے ان دونوں الفاظ ''اللہ'' اور ''رسول'' کے مصداق کے تعیّن کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔

چنانچہ یہ مسئلہ بھی تمام مسلمانوں کے نزدیک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اولی الأمر کی اطاعت واجب اور فرض ہے البتہ مسلمانوں کے درمیان اس پر اختلاف ہے کہ

- اولی الأمر کون ہے؟
- اولی الأمر کی اطاعت کی حدود کیا ہیں؟
- اولی الأمر کی شرائط کیا ہیں؟

خود آیہء شریفہ کا بغور مطالعہ کرنے اور قرآن پر تفسیر بالرّائے کو مسلّط نہ کرنے کی صورت میں مذکورہ تین سوالوں کا جواب حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے اور مصداق کے لحاظ سے آیہء شریفہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اطاعت خدا اور رسولؐ کی حدود و شرائط پہلے ہی معلوم ہیں اور رسولؐ کی عصمت پر بھی تمام مسلمان متفق ہیں۔ اس کے علاوہ اطاعت خداوند کریم اور اطاعتِ رسول خدا کے فوراً بعد اولی الأمر کی اطاعت کا ذکر کرنے سے یہ استنباط بلکہ استظھار بطور یقین کیا جاتا ہے کہ

(i) اولی الأمر، صفاتِ رسول اکرمؐ کا حامل ہو یعنی معصوم ہو۔

(ii) خدا اور رسولؐ کی مکمل اطاعت کرتا ہو اور مکمل طور پر ان کے نظریات و خطوط پر گامزن ہو۔

گویا کہ اولی الأمر کے دو مصداق ہو سکتے ہیں۔

ایک مصداق صورتِ امکان میں، اور یہ وہ اعلیٰ واشرف افراد ہیں جو علم، فضیلت اور عصمت میں رسولؐ جیسے ہوں، جیسا کہ روایات اور احادیث متظافرہ (کثیر) اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اپنے معصوم جانشینوں کا تعیّن فرمایا تھا اور وہ حضرت امیر المؤمنینؑ سے لے کر حضرت صاحب الزمانؑ تک ہیں، چونکہ اس وقت احادیث اور روایات کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، اس لئے ہم آگے چل کر احادیث بیان کریں گے۔

معصوم اولی الأمر کے ساتھ ساتھ ان افراد اور فقہاء کا بھی اس ضمن میں ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو کہ خود معصومینؑ کی حیات کے دوران ان کی طرف سے ان کے نمائندہ تھے۔ مثلاً جیسا کہ حضرت علیؑ نے اپنے دورِ حکومت میں مالکِ اشترؒ، محمدؒ ابن ابی بکر اور عثمان ابن

حنیفؓ کو گورنر مقرر فرمایا تھا، ان سب کی اطاعت بطورِ اولی الأمر واجب تھی۔ البتہ ان کو مستقل اولی الأمر کی حیثیت حاصل نہیں تھی لیکن امامؑ کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے ان کے حکم کی تعمیل ضروری اور لازم تھی۔ یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ مذکورہ افراد اگرچہ وکالت ونیابت کی باقی شرائط کے حامل تھے لیکن عصمت کی صفت سے بلا شک وشبہ محروم تھے پھر بھی ان کی اطاعت ضروری ولازمی تھی۔

اسی طرح **عہدِ غیبتِ کبریٰ** میں جبکہ امام معصومؑ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں، ان کے نمائندہ افراد کی اطاعت کے ضروری ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

لیکن یہاں شرطِ عصمت مفقود ہونے کی وجہ سے اطاعت کی شرائط اور حدود کا تعین ہونا ضروری ہے، جیسا کہ آئندہ صفحات میں ذکر کیا جائے گا۔ اسکے علاوہ فقیہ جامع الشرائط کے متعلق فرامین ائمہ معصومینؑ اور ارشاداتِ رسولؐ کو سامنے رکھا جائے، مثلاً رسول اکرمؐ نے فقیہ کو "خلفآئی" (میرے جانشین) اور امام زمانہؑ نے "حجتی" (میری حجّت) سے تعبیر فرمایا ہے۔

ان فرامین کا لبّ لباب یہی ہے کہ فقیہ جامع الشرائط صاحبِ امر ہے۔ یعنی زمانہ غیبت میں فقیہ جامع الشرائط تمام مسلمانوں کے سیاہ وسفید پر حاکم ہے۔ جیسا کہ رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ اپنے اپنے دور میں اس منصب پر فائز تھے۔

اس بناء پر فقیہ کو اولی الأمر ماننا امام معصوم کو اولی الأمر ماننے کے مخالف نہیں ہے اور اس میں کوئی تضاد بھی نہیں پایا جاتا، بلکہ یہ ولایت اولی الأمر کے استمرار وامتداد کا واحد ذریعہ ہے اور ولایت امامؑ اور ان کی تعین کردہ حدود میں رہ کر فرائض انجام دینا ولایتِ فقیہ ہے۔

لہٰذا اگر ولی فقیہ ایک لمحے کے لئے بھی ولایت امامؑ اور ان کی مقرر کردہ حدود سے خارج ہو جائے یا بالفاظ دیگر اطاعت امام اور اطاعت رسولؐ سے بغاوت کرے چاہے یہ بغاوت فکری ہو یا عملی، اس سے اولی الامر کی خاصیت فوراً سلب ہو جائے گی اور اس کے پاس کسی قسم کی ولایت یا حکومت کا حق نہیں رہ جائے گا، اس طرح اولی الامر کا مقام بھی فوراً اس سے چھن جاتا

ہے۔

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہرکس وناکس ''اولی الأمر'' کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتا اور نہ ہرکوئی حاکم یا ہر صاحبانِ حل وعقدِ اسلامی حاکم اور اولی الأمر بن سکتے ہیں۔ بلکہ مطلب اس کے برعکس ہے، جو شخص اسلامی قانون کے مطابق حاکم ہوگا وہی سیاہ وسفید پر حاکم اور اولی الأمر ہونے کی صلاحیّت رکھتا ہے۔

خلاصہ

مختصر یہ کہ اولی الأمر کے دو مصداق ہے۔ ا۔مثبت۔ ۲۔منفی۔

مثبت کے بھی دو مصداق ہیں۔

ا۔معصوم۔

۲۔غیر معصوم، لیکن معصوم کے خطوط اور نقشِ قدم پر چلنے والے۔

یعنی وہ کم از کم عادل اور رہبری کی صلاحیّت کے مالک ہوں۔

غیر معصوم کے بھی دو مصداق ہیں۔

ا۔خود ائمہؑ کے حکم کے مطابق ان کی بابرکت زندگی میں اس قسم کے بہت سے افراد موجود تھے۔مثلاً حضرت علیؑ کے تمام گورنر اور دیگر ائمہؑ کے وکلاء۔

۲۔زمانِ غیبتِ کبریٰ میں فقیہ جامع الشرائط اس منصب ''اولی الأمر'' کا مصداق ہے۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ غیرِ معصوم اولی الأمر کا منصبِ اولی الأمر، وکالۃً ثابت ہے، یعنی ولایتِ فقیہ یا ولایتِ ''والی'' (گورنر) ولایتِ امامؑ کی خادم کی حیثیت سے ہے نہ کہ اس کے منافی کوئی چیز ہے۔

اولی الأمر کے منفی مصداق میں وہ سب حاکم اور صاحبانِ بست وکشاد شامل ہیں جن میں اسلامی قانون (قرآن وسنّت) کی مقرر کردہ شرائط وصفات مفقود ہیں۔

ولایتِ فقیہ احادیث کی روشنی میں

اسلام کے مزاج کے مطابق ولایتِ فقیہ کا مسئلہ قابلِ بحث وگفتگو نہیں ہے۔ لیکن اس کی حدود اور اس کے اختیارات پر بحث کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر ولایتِ فقیہ کی اثبات پر کوئی خاص نقلی دلیل موجود نہ بھی ہو تو بھی اسلامی احکام اور شریعتِ محمدیہ کے عالمی اور جاوید ہونے کے باوجود اس کو عملی میدان سے خارج کرنا اس کے دوام وبقاء کے منافی ہے۔

لہٰذا اس کے اجراء کا صرف ایک ہی طریقہ ہوسکتا ہے جو ہر لحاظ سے طریقہ انبیاءؑ وائمہ اطہارؑ کے فرامین کے سب سے زیادہ نزدیک ہو۔

جیسا کہ ولایتِ فقیہ پر عقلی بحث کے دوران یہ بات واضح کی گئی تھی کہ حکومت چلانے کے امکانات اور احتمالات کے اعتبار سے ولایتِ فقیہ کا نظریہ دیگر تصور کردہ تمام نظریات سے زیادہ درست اور صحیح نعم البدل ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لئے ولایتِ فقیہ کا نظریہ ہی نافذ ہونا ضروری ہے۔

نظریہ ولایتِ فقیہ کی اس بداہت کے باوجود اس مقام پر چند احادیث اور روایات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ اس موضوع سے متعلق ہر قسم کے شک وشبہ کو ختم کیا جاسکے۔

اربابِ فقہ سے پوشیدہ نہ رہے کہ اس کتاب میں روایات سے اس طرح استدلال نہیں کیا جائے گا جس طرح ہمارے فقہائے کرام کرتے ہیں کیونکہ وہ طریقہ صرف اربابِ فن کے لئے مفید ہوسکتا ہے جبکہ اس مختصر سی کتاب کے ذریعے جدید نسل کے فکری خلاء کے ایک گوشے کو پُر کرنا مقصود ہے۔ اور ہمارے اس دور کے نوجوان اور اسلامی معارف وسرچشمہ حیات سے تشنہ افراد

استدلال کے فنی طریقوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ ان کی فکری سطح کے مطابق سادہ انداز میں استدلال پیش کریں۔ چنانچہ اس موضوع پر استدلال شدہ تمام احادیث بیان کرنے کی بجائے صرف چند احادیث نبویؐ اور روایات معصومینؑ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حدیث اوّل

''قال رسول اللہ(ص)اللھم ارحم خلفآئی ،ثلاث مرات قیل یارسول اللہ(ص) ومن خلفآئک؟قال(ص)الذین یأتون من بعدی ویروون احادیثی وسنّتی(حدیثی وسنّتی)فیسلّونھا النّاس من بعدی وفی بعض النّسخ ثمّ یعلّمونھا النّاس.''

''رسول اکرمؐ نے تین مرتبہ فرمایا''اے میرے پروردگار! میرے خلفاء (جانشینوں) پر رحم فرما''۔حضور اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ آپؐ کے خلفاء کون ہیں؟حضورؐ نے فرمایا(میرے خلفاء) وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور میری احادیث اور سنّت کو بیان کریں گے اور لوگوں تک پہنچائیں گے۔اور بعض نسخ کے مطابق یہ ہے کہ''پھر لوگوں کو سکھائیں گے''۔

(الوسائل.ج ۱۸/ص ۱۰۱،الحیاۃ ج ۲/ص ۲۸۱،اساس الحکومۃ ص ۱۴۳)

مذکورہ مضمون کی ایک اور حدیث رسول اکرمؐ سے مروی ہے:۔

''اللھم ارحم خلفآئی ،فقیل یارسول اللہ(ص) ومن خلفآئک؟ قال(ص)الذی یحیون سنّتی و یعلّمونھا عباد اللہ''

''پروردگارا! میرے خلفاء (جانشینوں) پر رحم فرما۔ پوچھا گیا، یارسول اللہ! آپ کے خلیفہ کون ہیں ؟فرمایا ۔''وہ جو میری سنّت کو زندہ رکھیں اور اسے بندگانِ خدا کو سکھائیں۔'' (منیة المرید. ص ۱۰۱ ،الحیاة. ج ۱/ص ۲۸۱)

ان دونوں ہم مضمون حدیثوں میں چند چیزیں قابلِ توجہ و بحث ہیں، اور ہم علی الترتیب ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ خلفائی۔

۲۔ تین مرتبہ دعا فرمانا۔

۳۔ حدیث وسنّت دونوں کا ذکر فرمانا۔

۴۔ دوسری حدیث کے مطابق ''سنّت'' کو زندہ رکھنا۔

۱۔ خلفائی

(i) دونوں حدیثوں میں لفظ ''خلفائی'' موجود ہے، جس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ ہر وہ مقام جو رسول اکرمؐ کو حاصل تھا وہی مقام ان کے جانشینوں کو بھی حاصل ہے، لیکن اس سے مراد وہ مقام نہیں ہے جو عقلی اور نقلی دلائل اور قرآن وسنّتِ قطعیہ کے مطابق صرف رسول اکرمؐ کو حاصل تھا۔ یعنی مذکورہ حدیث سے قطع نظر کوئی خاص ایسی دلیل موجود ہو جو کسی خاص مقام ومنصب کی ان کے جانشین کے لئے نفی کرے اور اسے صرف اور صرف ذاتِ رسولؐ سے مخصوص ہونا بیان کرتے ہوئے لفظ ''خلفائی'' کے اطلاق کو مفید اور اس کے وسیع دائرہ کو تنگ اور محدود کرے۔ مثلاً وحی، نبوت، عصمت، ولایتِ تکوینی وغیرہ جو عموماً اسلامی نظام چلانے کے امور سے زیادہ مربوط نہیں، یہ تمام مقام جانشین رسول کے لئے ثابت نہیں۔

یادرہے کہ ان جانشینوں سے مراد وہ افراد ہیں جو **غیبتِ کبریٰ** کے زمانے میں اس مقام پر فائز ہیں، کیونکہ رسول اکرمؐ کے دو قسم کے جانشینوں کے ہم قائل ہیں۔

ا۔جن کی خلافت وجانشینی پر خاص دلیل موجو ہے،جس کی رو سے ان میں سے ہر ایک خلیفہ وجانشین کا تعیّن کیا گیا ہے اور یہ افراد قرآن اور روایت کی اصطلاح میں ائمہ معصومین ؑ معروف ہیں۔

۲۔وہ افراد جو زمانہ غیبتِ امام میں نیابت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

اس مطلب کی تفصیل یہ ہے:۔

قرآن اور سنّتِ رسولِ اکرمؐ کے مطابق رسول اکرمؐ کے بعض ایسے خلیفہ بھی موجود ہیں جن کے مقام ومنصب کا تعیّن آپ کی زندگی میں ہی کیا گیا،رسول اکرمؐ نے کبھی قرآنی آیات کی تفسیر وشانِ نزول کے ضمن میں اور کبھی اپنی زبان مبارک سے امت مسلمہ کے رہبروں کی صفات اوران کے نام ونسب واضح الفاظ میں بیان فرمائے کہ جب یہ حضرات موجود ہوں تو تمام امتِ مسلمہ کو چاہیئے کہ ان کی طرف رجوع کرے،کسی اور شخص کو مستقلاً کوئی مقام ولایت ورہبری حاصل نہیں،جیسا کہ خود رسول اکرمؐ کے دور میں ہر ایک پر فرض تھا کہ آپؐ کی پیروی کرے اور آپؐ کی ولایت وحکومت کی اطاعت کرتے ہوئے مقام نبوت وولایت سے حکم صادر ہونے کا منتظر رہے۔اگر رسول اکرمؐ نے کسی موقع پر کوئی مقام ومنصب کسی کو دیا تو اس مقام کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے لئے تعمیل حکم ضروری تھا۔

بہر حال ہمارا مقصد اس قسم کی ولایت پر بحث کرنا نہیں ہے جس کا تعیّن خود رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے۔چاہے اپنی زندگی میں وقتی طور پر ہی کسی کو نامزد کیا تھا یا عہدِ رسالت کے بعد کے ادوار کے لئے۔

پھر یہ خلیفہ وقت کبھی معصوم بھی ہوسکتا ہے کبھی غیر معصوم بھی،جیسا کہ ان کا مستقل خلیفہ بھی عقلی طور پر دو احتمالوں سے خالی نہیں مگر شرعی دلائل اس حقیقت پر قائم ہیں کہ خلفاءِ رسول (جن کی نشاندہی خود آپؐ نے فرمائی ہے اوران کی تعداد کا تعیّن فرمایا ہے) سب کے سب معصوم ہیں اوران معصومین کے اوصاف بھی خود زبان رسالت سے بیان کیے گئے ہیں اور زیر بحث حدیث بھی

معصوم خلفاء کی موجودگی میں ان پر منطبق ہو جاتی ہے اور لفظ '' خلفآئی '' کا باقی اوصاف کے بغیر ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مراد صرف معصوم خلفاء نہیں بلکہ مذکورہ صفت کے حامل تمام افراد ہیں۔ اور ان کے یہ خلفاء معصوم بھی ہو سکتے ہیں، جیسا کہ خود رسول اکرم معصوم ہیں لہٰذا ان سے صرف وہ چیز سلب کی جاتی ہے جو کہ خود نبوت کے لوازمات سے ہو، یعنی خود نبوت و وحی۔ لیکن عصمت کو مستثنیٰ قرار دینے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

ہماری گفتگو اس قسم کے خلفاء کے متعلق نہیں، بلکہ ہمارا موضوع بحث وہ خلفاء ہیں جن کی ولایت و خلافت پر نہ کوئی مخصوص دلیل موجود ہے اور نہ ان کا نام یا خصوصی صفات حضور اقدسؐ کی زبان سے سنی گئی ہیں بلکہ ان کی ولایت وخلافت عمومی دلائل واوصاف کے مطابق زمانِ غیبت میں ثابت ہے، جو مخصوص صفات ان افراد سے سلب کی گئی ہیں وہ حضورؐ یا ان کے معصوم خلفاء کے لئے مخصوص تھیں مگر ان کے چند خلفاء کی عصمت، قرآنی دلائل و احادیث کی روشنی میں ثابت ہے۔ مگر دوسری قسم کے خلفاء کے لئے عصمت ثابت نہیں ہے۔ البتہ عصمت کی بجائے عدالت، تقویٰ و پرہیز گاری کا ہونا شرط ہے جسے بعد میں بیان کیا جائے گا۔

حدیث شریف میں لفظ '' خلفآئی '' کا ہونا اور اس کے ساتھ عصمت کی قید کا نہ لگنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خلافتِ رسول صرف ائمہ معصومینؑ میں ہی منحصر نہیں ہے۔

خلاصہ

مختصر یہ کہ '' خلفآئی '' کے دو مصداق ہو سکتے ہیں:

۱۔ خلفاءِ معصومینؑ جن کی تعداد معیّن ہے، یعنی بارہ۔

۲۔ خلفاءِ غیر معصومین جو زمانہ **غیبتِ کبریٰ** میں ضروری ہیں۔

جس طرح رسول اکرمؐ کو ولایتِ عامہ حاصل تھی، یعنی آپ لوگوں کے سرپرست اور ان کے اموال و نفوس پر حاکم تھے۔

اسی طرح ان کے خلیفہ کو بھی حق ''ولایتِ عامہ'' حاصل ہے کیونکہ اگر خلفا کے لئے ولایتِ عامہ ثابت نہ ہوتی اور رسول اکرمؐ کے بعد صرف بعض امور میں ان کو دخالت کا حق حاصل ہوتا اور ہر وہ مقام و منصب جو رسول اللہؐ کو حاصل تھا، ان کو حاصل نہ ہوتا تو حدیث کی تعبیر کا کچھ اور ہونا ضروری تھا۔ اس لئے جب تک کوئی خاص دلیل کسی خاص مقام و منصب کو خارج نہیں کر دیتی، اس وقت تک تمام تر مقام ولایت اور حکومت عامہ جو رسول اکرمؐ کے لئے ثابت ہے ان کے خلفاء کے لئے بھی ثابت ہے ورنہ یہ کیسے خلیفہ ہوئے؟

۲۔ تین مرتبہ دعا فرمانا

تین مرتبہ رسول اکرمؐ کا ان خلفاء کے حق میں دعا فرمانا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور آپؐ ان کے سپرد ایک گراں بہا چیز کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہی ہے کہ نیابتِ عامہ اور ولایتِ عامہ کے فرائض کی انجام دہی سے بڑھ کر کسی اور فریضہ یا مقام کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ حدیث وسنت دونوں کا ذکر فرمانا

بعض روایات کے مطابق لفظ احادیثی جمع استعمال ہوا ہے جیسا کہ بعض روایات کے مطابق لفظ مفرد حدیثی ذکر ہوا ہے۔ بہر حال قابل بحث اور غور طلب بات یہ ہے کہ حدیث وسنّت دونوں کے ذکر سے ایک اہم معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے، کیونکہ فقہاء ومحدّثین کی اصطلاح میں ''سنّت اور حدیث'' ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں، یعنی جہاں بھی الفاظِ حدیث الرّسول اور سنّت الرّسول کا اطلاق ہو تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے:

۱۔ قول الرّسول

۲۔ فعل الرّسول

۳۔ تقریر الرّسول۔ یعنی کسی فعل پر رسول اکرمؐ کی تنقید یا تصدیق۔

مگر رسول اکرمؐ کے دور میں حدیث الرّسول کے معنی سنّت الرّسول سے بالکل مختلف تھے جیسا کہ رسول اکرمؐ نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ، راستہ اور نہج اختیار کیا تھا اس پر سنّت الرّسول کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی عمل اور کردارِ رسول اکرمؐ۔ لیکن حدیث الرّسول کا اطلاق رسول اکرمؐ کے گراں بہا فرامین، احکامات اور گفتار پر ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ حدیث میں دونوں الفاظ کا ذکر ہے اور ان دونوں الفاظ کا الگ الگ مفہوم لیا جاتا ہے۔ اس لئے خلیفہ رسول کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ رسول اکرمؐ کے تمام اعمال و کردار اور گراں بہا اقوال و گفتار کا سب سے پہلے خود نمونہ ہو اور پھر وہ لوگوں تک اس حقیقت کو پہنچائے یعنی خلیفہ رسول خود رسول اکرمؐ کا عملی نمونہ بنے بغیر اس منصب پر فائز نہیں ہوسکتا، اور اسے رسول اکرمؐ کی قولی و عملی شخصیت کی نمایاں مثال ہونا چاہئے۔ لہٰذا جو صرف کتبِ احادیث سے روایات نقل کرتا ہے اور لوگوں کو صرف گفتارِ رسول سے روشناس کراتا ہے، گوکہ یہ عمل بذات خود اہم (پُر ارزش) اور قیمتی ہے لیکن اس سے وہ خلافت رسول کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جو صرف عملِ رسول کا نمونہ ہو (اگر کوئی ایسا پیدا ہو جائے) اور اقوال و گفتارِ رسول اکرمؐ سے لوگوں کو روشناس نہ کرائے وہ بھی خلافتِ رسول اکرمؐ کا مستحق نہیں بن سکتا۔

لہٰذا اس امر کی تکمیل اس وقت ممکن ہے جب کوئی شخص علم اور فہم و فراست کے اعتبار سے بلند ترین درجہ پر فائز ہو اور عملی میدان میں متّقی، پرہیزگار اور خدا طلب ہو۔ یہ چیز رسول اکرمؐ کے بعد ان کے معصوم جانشینوں میں پائی جاتی ہے، اور اس مفہوم کے سب سے پہلے بے مثال مصداق حضرت امیر المؤمنینؑ تھے۔ اس مطلب پر واضح ترین گواہی کتبِ احادیث و فضائل اور کتبِ سیرت میں موجود ہے کہ امیر المؤمنینؑ کا علم اور عمل کہاں تک علم و عملِ رسول اکرمؐ کا نمونہ تھا۔

حضرت امیر المؤمنینؑ کے بعد ہر دور میں رسول اکرمؐ کا معصوم خلیفہ انہی صفات، شرائط اور اخلاق اسلامی کا حامل تھا۔ اب زمانہ غیبت میں مذکورہ صفات و شرائط کا جو بھی حامل ہو وہ رسول

اکرمؐ کا غیر معصوم خلیفہ ہوسکتا ہے۔

لیکن عمل کا حقیقی (واقع عملی) مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صفات صرف اور صرف فقہائے عظام میں پائی جاتی ہیں۔لہٰذا یہی حضرات رسول اکرم کے خلیفہ و جانشین بن سکتے ہیں۔

۴۔سنّت کو زندہ رکھنا

مذکورہ دوسری حدیث میں الفاظ " یحیون سنّتی" یعنی "میری سنّت کو زندہ رکھیں گے" موجود ہیں، جس سے فقہاء کی اسلامی ذمہ داریوں کی اہمیت اوران پر محمول شدہ کام کی حدود بیان ہوتی ہیں۔

یہ بھی واضح ہے کہ اگر خلفاءرسول کے لئے وہ اختیارات اور ولایتِ عامہ نہ ہو جو خود رسول اکرمؐ کے لئے ثابت تھی تو سنّت رسول کو زندہ رکھنا ممکن نہیں ۔سنّت کو زندہ رکھنے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ احادیث وسنّتِ رسول صرف اور صرف کتبِ احادیث وسیرت رسول کی زینت بن جائیں اور معاشرے پر حاکم نہ ہوں، زبان پر سنّت وحدیثِ رسول کا وردتو ہو لیکن عملی میدان میں مشرقی یا مغربی نظام زندگی یا حکومت پر عمل پیرا ہوں۔

سنّتِ رسول کو زندہ رکھنے کا بہترین نمونہ یہ ہے کہ اجتماع اور مسلم معاشرہ کے ہر ہر پہلو پر صرف اور صرف عمل، گفتار واقوال رسول اکرمؐ اور قرآن مجید کا حکم حاکم ہو، اس مفہوم کو معاشرے میں رائج کرنے کی صورت صرف اس وقت نکلتی ہے جب خلیفہ رسول اکرم کو رسول اللہؐ کے وہ تمام اختیارات حاصل ہوں جو اصلاح معاشرہ اور عدل وانصاف پر مبنی حکومت اسلامی کو چلانے کے لئے ضروری ہیں۔

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جب بھی حکومت ظالموں، طاغوتوں اور فرعونوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس وقت سنّت رسولؐ کی پامالی اور احکام قرآن مجید سے روگردانی کی کوئی حد

نہیں اور ہر دور میں ائمہ معصومینؑ اپنے دور کی حکومتوں کی مخالفت کرتے رہے تاکہ پامال شدہ سنّتِ رسول اور دین خدا کو دوبارہ معاشرے پر حاکم بنائیں اور اس طریقے کو زندہ رکھا جائے۔

خود ائمہ معصومینؑ بھی اپنے دورِ زندگی میں سنّتِ رسولؐ اور احکام اسلام کو معاشرے میں نافذ نہ ہونے کی وجہ سے زندہ نہیں رکھ سکے بلکہ یہ سینہ بہ سینہ ایک دوسرے تک منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ مگر عملی میدان سے دور، حکام وقت کی مخالفت اور بددیانتی کی وجہ سے امت مسلمہ سنّت رسول اور احکام قرآن کی رہبری سے محروم رہی۔

امت مسلمہ اس وقت قرآن وسنت کی روشنی سے پوری طرح رہنمائی حاصل کرسکتی ہے جب اپنی زندگی کے تمام (انفرادی، اجتماعی اور اقتصادی) پہلو قرآن وسنّت کے مطابق گزارنے کا اسے موقع ملے اور اس کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ آزادانہ طور پر مغربی ومشرقی نظام ہائے زندگی کو ترک کرکے اسلام کا حیات بخش نظام اپنالے اور اپنے ارادہ وعمل سے اس نظام کو نافذ کرنے کی خاطر اسلامی حکومت تشکیل دے، پھر اس طرح وہ سنّتِ رسولؐ وقرآن کو زندہ کرسکتی ہے۔

اس لئے سنّتِ رسول کو زندہ رکھنے کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ خلفاء الرّسول کو حکومت کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہے اور صحیح اسلامی حکومت کا قیام ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے نظام اسلام کو زندہ وقائم رکھا جاسکتا ہے۔

حدیثِ دوم

"عن ابی عبدالله الصّادق (ع) قال، قال رسول الله (ص) الفقهآء امنآء الرّسل ما لم یدخلوا فی الدّنیا. قیل یا رسول الله (ص) وما دخولهم فی الدّنیا؟ قال اتباع السّلطان، فاذا فعلوا ذلک فاحذروهم علیٰ دینکم."

''امام صادقؑ سرورِ کائناتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا فقہاء جب تک دنیا (پرستی، دنیاوی امور) میں داخل نہیں ہوتے، وہ انبیاءِ الٰہیؑ کے امانت دار ہیں۔ پوچھا گیا، یارسول اللہؐ! (فقہاء کے) دنیاوی امور میں داخل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: سلطان (جابر حاکم) کی پیروی کرنا، جب وہ ایسا کریں تو ان سے (اپنے دین کی ضروریات حاصل کرنے سے) پرہیز کرو!'' (اصول کافی ج ۱ ص ۵۸)

اس روایت میں فقہاء کو انبیاءؑ کا امین کہا گیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ امانت کیا چیز ہے؟ اور فقہاء کس چیز کے امین ہیں؟

امانت

امانت کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز کسی دوسرے کے سپرد کرنا تاکہ طلب کرنے پر کسی قسم کی خیانت، کمی بیشی اور تحریف و تنقیص کئے بغیر امین وہ چیز صاحب امانت کو واپس لوٹائے۔ یہ امانت ایک مادی شیء بھی ہوسکتی ہے اور ایک معنوی چیز بھی۔ اس امانت کے متعلق فریضہ اور حکم بھی مختلف ہوسکتا ہے، کبھی صرف اس کی حفاظت مقصود ہوتی ہے اور کبھی اس کی حفاظت کے علاوہ اسے دیگر افراد تک پہنچانا بھی ہوتا ہے، جیسا کہ انبیاءؑ احکام الٰہی اور شریعت کے امین ہوتے ہیں۔

یہاں پر انبیاءؑ کا کام صرف احکام الٰہیہ کی حفاظت کرنا یعنی انہیں صرف اپنی ذات کی حد تک محفوظ رکھنا مقصود نہیں بلکہ سب سے پہلے خود اس پر عمل کرنا اور پھر ان احکام کو کسی کمی بیشی کے بغیر لوگوں تک پہنچانا امانت کی ادائیگی کا صحیح مفہوم ہے۔

''اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً.''

''ہم عنقریب تم پر ایک بھاری حکم نازل کریں گے۔'' (مزمّل۔۵)

''یَـا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَ اِنْ لَّمْ

تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه‘ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ o"

"اے رسولؐ! جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، پہنچادو! اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا اور (تم ڈرو نہیں) خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، خدا ہرگز کافروں کی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔" (المآئدة ۔ ٦٧)

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا "

"(اے ایمان دارو!) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں امانت رکھنے والوں کے حوالے کردو۔" (النسآء ۵۸)

"وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ط وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ o"

"کسی نبی کی (ہرگز) یہ شان نہیں کہ خیانت کرے اور جو خیانت کرے گا تو جو چیز خیانت کی ہے قیامت کے دن وہی چیز (بعینہ خدا کے سامنے) لانا ہوگا اور پھر ہر شخص اپنے کئے کا پورا بدلہ پائے گا، اور ان کی کسی طرح حق تلفی نہیں کی جائے گی۔" (آلعمران ۱۶۱)

اس لئے انبیائے الٰہیؑ، خداوند کریم کے امین ہیں اور انبیاءؑ کے دو قسم کے رابطے ہیں:

۱۔ خدا سے رابطہ۔

۲۔ لوگوں سے رابطہ۔

ہم انبیاءؑ کے دوسری قسم کے رابطے کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ پہلی قسم کے رابطے کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

انبیاءؑ کا لوگوں سے رابطے کا انحصار ولایتِ عامہ، سرپرستی اور ہدایت وارشاد پر ہوتا

ہے، یعنی انبیاءؑ کی موجودگی میں ہر قسم کی رہبری لوگوں کو ان سے ملتی ہے اور لوگوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان سے رہبری حاصل کریں جیسا کہ انبیاءؑ کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کی رہبری کریں۔

اس لئے انبیاءؑ کی غیر موجودگی میں فقہاء ان کے امین ہیں یعنی وہ تمام فرائض واحکام اور ضروریات دین و دنیا جن کا انحصار انبیاءؑ کی سرپرستی پر تھا اب وہ تمام کے تمام فقہاء کے سپرد کر دیئے گئے ہیں اور فقہاء انبیاء کے اسرار و امانت کے حامل ہیں لہٰذا یہ لفظ ''امنــآء الرّسـل'' درحقیقت ''خلفآء الرّسل'' کے معنی دیتا ہے۔

لوگوں کی ضروریات دو قسم کی ہوتی ہیں

۱۔ انفرادی زندگی کی ضرورت

۲۔ اجتماعی زندگی کی ضرورت

پہلی قسم میں احکام، حلال و حرام اور ازدواجی زندگی سے متعلق امور وغیرہ کا بیان شامل ہے۔ قسم دوم انسان کی اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی حقوق کی حفاظت پر مشتمل ہے، اور یہ حقوق اسی وقت محفوظ رہ سکتے ہیں جب ان کی حفاظت کے لئے کسی مدبّر اور عادل حاکم کی رہبری موجود ہو۔

نیز کوئی باشعور عاقل اور بافکر انسان یہ کبھی نہیں کہے گا کہ قسم اول کی ضرورت قسم دوم کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ قسم اول کی صحیح حفاظت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ دوسری قسم کی حفاظت کی ضمانت موجود ہو، یعنی اجتماعی وسیاسی حقوق کی ضمانت موجود ہونے کی صورت میں انفرادی حقوق کی نگہداری اور حفاظت کی ضمانت خود بہ خود مل جاتی ہے اور اس کے برعکس نہیں۔

لہٰذا اجتماعی امور کی اہمیت انفرادی امور کی اہمیت سے بڑھ کر ہے۔

اس کے علاوہ کیا یہ ممکن ہے کہ فقہائے عظام، انبیاءؑ کی زندگی کے ایک پہلو کے امین ہوں اور وہ صرف انفرادی زندگی سے متعلق امور میں انبیاءؑ کی امانت دار ہوں لیکن نہایت اہم اور زیادہ ضروری (اجتماعی) پہلو کے امین نہ ہوں؟ لوگوں کی دسترس نہ انبیاءؑ تک ہو اور نہ فقہاء

تک، پھر یہ کس کی طرف رجوع کریں؟ ظالم حکومتوں کیطرف؟

یا اس بارے میں کوئی حکم خداوندی نہیں؟ یعنی کیا شریعتِ الٰہیہ منسوخ ہو چکی ہے؟ یا وہ ایک مدت تک معطل کردی گئی ہے؟

یا پھر یہ کہ یہ سب احتمالات غلط ہیں اور جو انبیاءِ الٰہی کی شریعت سے سب سے زیادہ نزدیک ہو اس کی طرف لازماً رجوع کرنا چاہئے؟

امیر المؤمنینؑ نے فرمایا:

''ایّھا النّاس انّ احقّ النّاس بھٰذاالأمر اقواھم علیه واعلمھم بأمر الله فیه ''

''لوگو! اس امر (خلافت) کا حق دار صرف وہ ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور امر خداوندی کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔'' (نھج البلاغہ الحیاۃ ج ۲ / ص ۲۸۴)

اس لئے ''امنآء الرّسل '' کے معنی میں ''خلفآء الرّسل '' ہونے کا قرینہ بھی موجود ہے، یعنی اس سے مراد زعامت، حکومت اور ولایت ہے، جیسا کہ حضرت امام رضاؑ سے مروی ہے:

''لو لم یجعل لھم اماماً قیّماً اميناً حافظاً مستودعاً لدرست الملّة وذھب الدّين وغيّرت السنّة والأحكام ''

''اگر لوگوں کے لئے ایک قوی، امین اور دین کے محافظ امام کا تقرر نہ ہو تو ملت تباہ اور دین کا خاتمہ ہو جائے اور سنّت و احکام بھی باقی نہ رہیں۔'' (بحار ج ۶ جدید / ص ۶۰)

مگر اس حقیقت کے ساتھ ساتھ فقہاء کے لئے مقررہ شرائط کی پابندی کرنا بھی ضروری ہے، یعنی ہر موجودہ ظالم حکمران سے گٹھ نہ جوڑنا اور اس کی تائید نہ کرنا بلکہ اس کی مخالفت کرنا (جہاں مخالفت کا اظہار ضروری ہو)۔

چند شرائط ایسی بھی ہیں جن پر پورا نہ اترنا، منصبِ الٰہی اور زعامتِ عامہ سے محروم ہونے کا سبب بن جاتا ہے، اس کی تفصیل شرائطِ فقیہ اور ان کے اوصاف بیان کرتے وقت پیش کریں گے۔

حدیثِ سوم

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے:

"اذا مات المؤمن (وفی روایة اخری "المؤمن الفقیه") بکت علیه الملآئکة وبقاع الأرض الّتی کان یعبد الله علیها وابواب السّمآء الّتی کان یصعد فیها بأعماله وثلم فی الأسلام ثلمة لا یسدّها شیء لأنّ المؤمنین الفقهآء حصون الأسلام کحصن سور المدینة لها "

"جب کسی مومن (فقیہ) کا انتقال ہوتا ہے تو تمام فرشتے، زمین کے وہ ٹکڑے جہاں وہ اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا اور آسمان کے وہ دروازے جن سے اس کے اعمال اوپر جاتے تھے اس پر آنسو بہاتے ہیں اور اسلام میں ایک ایسا شگاف پڑ جاتا ہے جو کسی چیز سے بند نہیں ہوسکتا کیونکہ مومن فقہائے اسلام کا مضبوط قلعہ ہیں، جیسا کہ کسی شہر کا قلعہ ہوتا ہے۔" (الکافی ج ۱ ص ۴۷)

یہ حدیث علماء اور فقہاء کی ناقابل انکار اہمیت کو واضح کرتی ہے جیسا کہ حدیث میں علماء وفقہائے باایمان کو اسلام کے مضبوط قلعہ اور محکم پناہ گاہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور شہر کی حفاظت کرنے والی دیوار[1] سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسلام بھی ایک ایسے شہر کی مانند ہے جس کے داخلی وخارجی دشمن

---

[1] گزشتہ زمانے میں شہروں کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کے اردگرد بڑی بڑی دیواریں بنادی جاتی تھیں جنھیں "سور البلد" کہا جاتا ہے۔

بہت سے ہیں، جنھوں نے اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمیشہ اس پر پے در پے حملے کئے ہیں۔ تاریخ اسلام اس امر کی شاہد ہے۔ یاد رہے ان حملوں کی تمام قسموں میں سے سب سے موثر، کمر توڑ اور وزنی حملہ آئیڈیالوجی (نظریات) پر ہوتا ہے۔

اس حملہ کو پسپا کرنے اور اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حق اسے حاصل ہے اور اس کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے جو بذاتِ خود اسلام کے اصولوں سے آشنا ہو۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع ان افراد پر واجب و لازم ہے جو خود ان سرحدوں کے سچے سپاہی اور سرفروش مجاہد ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی فقہائے عظام کے علاوہ کسی اور فرد میں نہیں پائے جاتے، اس لئے اسلام پر کیے جانے والے تمام شکوک و شبہات کا جواب فقہاء اور اسلام شناس ہی دے سکتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کا مضبوط قلعہ فقہاءِ عظام ہوئے جن سے دفاعی سرحدوں کا دفاع میسّر آتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک روایت پیش خدمت ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔

"علمآء شیعتنا مرابطون فی الثغر الذی یلی ابلیس و عفاریته یمنعونهم عن الخروج علیٰ ضعفآء شیعتنا ،وعن ان یتسلط علیهم ابلیس و شیعته النواصب الا فمن انتصب لذٰلک من شیعتنا کان افضل ممن جاهد الرّوم و.. الف الف مرّة لأنه یدفع عن ادیان محبینا ،وذٰلک یدفع عن ابدانهم."

"ہمارے شیعہ (نظریاتی) سرحد کے محافظ ہیں جو ابلیس اور اس کے سرکردہ چیلوں کو ہمارے (علم و معرفت کے لحاظ سے) کمزور شیعوں پر (اپنے ارادے اور غلط افکار) مسلّط کرنے سے روکتے ہیں۔ آگاہ رہو! ہمارے شیعوں میں سے جو اس فریضہ پر قائم ہو وہ ان مجاہدین سے ہزار ہزار درجہ بہتر ہے جنھوں نے روم وغیرہ سے جہاد اور مقابلہ کیا ہو، کیونکہ یہ

(شیعہ علماء) ہمارے دوستوں کے دین کا دفاع کرتے ہیں اور وہ (روم سے جہاد کرنے والے) مسلمانوں کے جان (ومال) کا دفاع کرتے ہیں۔" (الاحتجاج ج ۲/ ص ۱۵۵، الحیاۃ ج ۲/ ص ۳۰۸)

"قال معاویہ بن عمّار قلتُ لأبی عبداللّٰہ (ع): رجل راویة لحدیثکم یبث ذٰلک فی النّاس و یشدّدہ فی قلوبھم وقلوب شیعتھم ولعل عابداً من شیعتکم لیست لہ ھذہ الرّوایة، ایّھما افضل؟ قال الرّوایة لحدیث یبث فی النّاس فی قلوب شیعتنا افضل من الف عابد۔"

"معاویہ ابن عمار کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ سے پوچھا کہ آپؑ کی حدیث کے کچھ راوی ایسے ہیں جو آپؑ کی احادیث لوگوں میں نشر کرتے ہیں اور آپؑ کے شیعوں کے دلوں میں راسخ کر دیتے ہیں شاید آپؑ کے شیعوں میں کچھ ایسے عابد بھی ہوں جو اس قسم کی روایت سے محروم ہیں، ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ امامؑ نے جواب میں فرمایا: وہ راوی جو ہماری احادیث لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور ان کے دلوں میں راسخ کرتے ہیں ہزار عابدوں سے بہتر ہیں۔" (الحیاۃ۔ ج ۲/ ص ۳۰۷)

اس کے علاوہ اسلام جغرافیائی سرحدوں کا قائل ہی نہیں ہے، جہاں اسلامی نظریہ پایا جائے وہاں تک اسلامی وطن پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

اسلامی ممالک کو اپنے داخلی دشمنوں کے علاوہ بیرون ملک دشمنوں سے بھی ہمیشہ خطرہ رہتا ہے اور اندرونی و بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کیے بغیر سرحدوں اور محاذ جنگ پر فتح حاصل ہونا نہ ہونے کے برابر ہے اس محاذ جنگ پر حملہ کرنے یا دفاع کرنے کی صلاحیت اور اختیار اگر فقہائے عظام کو حاصل

نہ ہوتو پھر فقہائے اسلام، اسلام کا مضبوط قلعہ کیسے بن سکتے ہیں؟۔

کیا اسلام صرف ایک ایسا نظریاتی نظام ہے جو قابل عمل و تطبیق نہیں ہے یا اس میں تطبیق و نفاذ کی ضرورت کا احساس اور عنصر موجود نہیں ہے؟

کوئی بھی مسلمان مذکورہ سوال سے اتفاق نہیں کرے گا بلکہ فورا بلا جھجک جواب دے گا کہ اسلام قابل تطبیق بھی ہے اور نفاذ کی ضرورت کا احساس بھی اس میں موجود ہے، یہ بھی اظہر من الشّمس ہے کہ نفاذ اسلام اور تطبیق احکام شریعت وہی کر سکتا ہے جو اسلام کے تمام پہلوؤں اور سارے اصولوں سے واقفیت رکھتا ہو، یہ صفت فقہاء عظام کے علاوہ کسی اور شخص میں پائی جانا ناممکن ہے۔

چنانچہ فقہائے عظام کو اگر نفاذ اسلام کا اختیار دیا گیا ہو تو وہ درجہ ذیل امور میں اسلام کا مضبوط قلعہ بن سکتے ہیں۔

۱۔ بیان احکام اسلام۔ ۲۔ نظریاتی سرحدوں کے دفاع۔

۳۔ داخلی اور خارجی دشمنوں سے مقابلہ۔

۴۔ خود نظام اسلام کا نفاذ اور اسکی تطبیق کی صلاحیت واختیار انکے سپرد کر دیا گیا ہو۔

ان کے علاوہ ان فقہاء کیلئے اسلام کا مضبوط قلعہ بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بلکہ وہ قلعہ تو کیا ایک نازک سی دیوار بھی نہیں بن سکتے جن کے ہاتھوں میں اسلامی معاشرہ میں دخل اندازی کا اختیار نہ ہو اور جو مسلمانوں کے تمام اجتماعی امور میں سرپرست کی حیثیت سے رہنمائی کرنے سے قاصر ہوں جیسا کی استعماری طاقتوں کی کوششوں کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ فقہاء میں صرف مسجد جانے اور مسجد کی چار دیواری کی حدود میں گفتگو کرنے کی صلاحیت ہے۔

اس لئے فقہاء صرف مسجد کے اندرونی امور پر حاکم ہو کر اور زندگی کے ہر پہلو سے الگ تھلگ رہتے ہوئے فتویٰ دینے سے اسلام کا مضبوط قلعہ کس طرح بن سکتے ہیں؟ اگر ان سے

مسلمانوں کی قیادت و رہبری چھین لی جائے تو وہ اسلام کی خاطر اسلامی قوانین کے مطابق ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے، تو پھر ان کو ''حصن الأسلام'' اور مضبوط قلعہ سے تعبیر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نیز ''حصن'' اور قلعہ کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت امن وسلامتی کا احساس دلانا ہے، گویا کہ فقہاء کے ذریعے اسلام کو امن وسلامتی کی ضمانت دی گئی ہے یعنی اسلام ان کی وجہ سے تحریف اور غلط تاویلوں سے محفوظ رہے گا۔ کیونکہ فقہائے اسلام کا حقیقی چہرہ مسلمانان عالم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ چاہے یہ چہرہ سیاسی ہو یا اجتماعی، اقتصادی ہو یا اخلاقی و تربیتی۔ بہر کیف فقہائے اسلام کو ایک زندہ نمونہ عمل ہونا چاہیئے تا کہ مسلمانوں کی تمام مشکلات کا سرچشمہ جواب ہوں، جیسا کہ روایات اسلامی میں آیا ہے:

''(عن النبیؐ) اذا ظهرت البدع فی امّتی فلیظهر العالم علمه فمن لم یفعل فعلیه لعنة اللّٰه''

''رسول اللہؐ نے فرمایا:۔ جب میری امت میں بدعتیں ظاہر ہو جائیں تو عالم (پر فرض ہے کہ وہ) اپنا علم ظاہر کرے اگر ایسا نہ کیا تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔'' (الحیاۃ ج ۲/ص ۲۹۱)

رسول اکرمؐ نے عابد پر عالم کی برتری بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''..... ذٰلک ان الشیطان یضع البدعة للنّاس فیبصرها العالم، فینهی عنها.''

''۔۔۔۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شیطان (انسان کی شکل میں) لوگوں کے درمیان بدعت چھوڑتا ہے جسے عالم دیکھتا ہے اور روکتا ہے۔'' (الحیاۃ. ج ۲/ص ۲۹۱)

''عن الأمام الصّادق (ع) قال رسول اللّٰه (ص) یحمل هذاالد ین فی کل قرن عدول، ینفون عنه تأویل المبطلین، وتحریف

الغالین، وانتحال الجاھلین."

"امام صادقؑ اپنے جدامجد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ہر دور میں اس (دین) کا ایک عادل نگہبان گروہ پیدا ہوگا جو اس (دین) سے اس کو مٹانے والوں کی تاویلیں زیادہ روی کرنے والوں کی تحریفیں اور جاہلوں کے خود ساختہ مذاہب کو دور کرے گا۔" (الحیاۃ ج۲/ص ۲۹۱)

یہ نکتہ بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ بدعت صرف عقائد اور ذہن سے مربوط مسائل تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں تک پھیل سکتا ہے، خاص طور پر اس دور میں ہر لمحہ، ہر قدم اور ہر نظریہ بدعت بھی ہوسکتی ہے اور اسلامی اصولوں کے مطابق بھی۔ جیسا کہ حکومت چلانے کا طریقہ اقتصادی نظام، تربیتی نظام، سیاسی نظام اور بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد وغیرہ ان تمام میں بدعت اور خلاف اسلام ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے دائرہ بدعت صرف، چند اصولی اعتقاد تک محدود نہیں ہے، لہٰذا پہلی روایت میں لفظ "بدع" جمع اور دوسری روایت میں لفظ "بدعت" الف، لام استغراق (شمولیت) یا جنس کے ہمراہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان بدعتوں سے نہی کرنا بھی صرف لفظی اور زبانی دائرہ کار پر موقوف نہیں بلکہ نفی کا بہترین مصداق عملی "نہی" ہے جیسا کہ امر و نہی کے مراتب میں سے ایک درجہ ہاتھ سے روکنا واجب ہونے کا بھی ہے جب کہ زبانی "نہی" مفید و موثر نہ ہو، کیا یہ قابل قبول فکر ہے کہ فقہائے عظام سے امر بالمعروف اور نہی از منکر کا ایک موثر پہلو سلب کرلیا جائے اور وہ مسلمانوں کے لئے کوئی عملی ہتھیار استعمال نہ کرسکیں؟

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام امر بالمعروف اور نہی از منکر کے مراتب یوں بیان فرماتے ہیں:

"ایّھا المؤمنون انّه من رای عدوانا یّعمل به، ومنکراً یدعیٰ الیه فأنکره بقلبه، فقد سلم وبریٔ ومن انکره بلسانه فقد

اجر وھو افضل من صاحبہ ومن انکرہ بالسیف لتکون کلمۃاللہ ھی العلیا وکلمۃ الظّالمین ھی السّفلیٰ،فذٰلک الذی اصحاب سبیل الھدیٰ وقام علی الطریق ونور فی قلبہ الیقین۔"

"اے اہلِ ایمان! جو شخص دیکھے کہ ظلم وعدوان پر عمل ہو رہا ہے اور بُرائی کی طرف دعوت دی جارہی ہے اور وہ دل سے اسے بُرا سمجھے تو وہ (عذاب سے) محفوظ، اور (گناہ سے) بری ہو گیا اور جو زبان سے اسے بُرا سمجھے وہ ماجور ہے، اور صرف دل سے بُرا سمجھنے والے سے افضل ہے اور جو شخص شمشیر بکف ہو کر اس بُرائی کے خلاف کھڑا ہو، تا کہ اللہ کا بول بالا ہو اور ظالموں کی بات گر جائے تو یہی وہ شخص ہے جس نے ہدایت کی راہ کو پالیا اور سیدھے راستے پر ہولیا اور اس کے دل میں یقین نے روشنی پھیلا دی۔" (الحیاۃ۔ ج ۲ ر ص ۳۰۰، نہج البلاغہ کلمات۔ ۳۷۳ ترجمہ مفتی مرحومؒ)

حدیثِ چہارم

اسحاق ابن یعقوب نے حضرت صاحب العصر والزّمانؑ سے چند مشکل مسائل کا جواب طلب کیا تو جواب میں آنحضرتؑ کی یہ توقیع آئی :

"وامّا الحوادث الواقعۃ فارجعوا فیھا الیٰ رُواۃِ احادیثنا فأنّھم حجّتی علیکم وانا حجّۃ اللّٰہ تعالیٰ علیھم (وفی روایۃ اُخریٰ)خلیفتی بدل حجّتی."

"مگر ان نئے نئے واقعات (کے حل میں) ہمارے راویان حدیث کی طرف رجوع کرو! کیونکہ وہ تم پر میری (طرف سے تعیین شدہ) حجت ہیں

اور میں ان پر حجت خدا ہوں۔ایک نقل کے مطابق لفظ ''حجّتی''
(میری حجت) کی جگہ لفظ ''خلیفتی'' بھی ہے،یعنی راویان حدیث
میرے جانشین ہیں۔''(انتظار الامام۔ص۱۱۱۳،الجواہر۔ص۶۱۷،
الوسائل۔ج۱۸ص۱۰۱باب۱۱صفات قاضی)

اس حدیث شریف میں چند نکتے قابل بحث وگفتگو ہیں:

۱۔الحوادث الواقعہ

حوادثِ واقعہ (پیش آنے والے واقعات) سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد صرف انفرادی مسائل ہیں؟ جیسا کہ نماز، روزہ، حج وغیرہ کے مسائل یا ان کے علاوہ ان میں اجتماعی اور ہر وہ مسئلہ بھی شامل ہے جو ہر زمانے میں اپنے تقاضوں کے مطابق رونما ہوتا ہے اور ایک نظام حیات سے جواب طلب بھی ہوتا ہے۔

بعض اشخاص نے ''حوادث واقعہ'' کو صرف انفرادی مسائل اور وقائع جزئیہ پر حمل کیا ہے مگر یہ حمل دور از حقیقت ہے، کیونکہ لفظ ''الحوادث'' میں زمانے کے تمام واقعات و حالات شامل ہوجاتے ہیں، کیونکہ اوّلاً تو یہ لفظ ''الحوادث'' جمع ہے ''حادثہ'' کی، اور ہر حادثہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

ثانیاً، اس جمع لفظ ''الحوادث'' پر ''الف'' اور ''لام'' موجود ہے جو تمام افراد کے استغراق (شمولیت) یا جنس افراد کے معنی دیتا ہے، یعنی انفرادی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی امور سے متعلق پیدا ہونے والے تمام مسائل کا حل اور ہر مشکل کا علاج مذہب اہل بیتؑ کے مطابق ان کے راویانِ حدیث سے دریافت کرنا ضروری و لازمی ہے، اس وسیع دائرہ میں نماز، روزہ کے مسائل بھی آتے ہیں، جیسا کہ مسائل صوم وصلوٰۃ کا دریافت کرنا ایک بدیہی امر ہے جو ایک جلیل القدر شخص سے پوشیدہ نہیں ہے۔اس لئے لفظ ''الحوادث'' دونوں طریقوں (جمع

اور الف ولام) سے تمام افراد پر بطور عموم دلالت کرتا ہے، نہ بطور اطلاق۔لہٰذا اس احتمال کی کوئی وقعت نہیں رہتی کہ شاید الف ولام سے اس مطلب کی اشارہ ہو جو امامؑ اور سائل کے درمیان تھا۔

''الف ولام عہد'' کا جواب ظاہر ہے کیونکہ اصل سوال موجود ہے جس میں کسی خاص مطلب کی طرف اشارہ ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ سائل نے کب اور کس کے ساتھ امام زمانہؑ کے ساتھ ملاقات کی تھی؟

اس لئے یہ احتمال دینا کہ امام اور سائل کے درمیان شاید کوئی خاص سوال ہوا ہو اور وہ سوال ہم تک نہ پہنچا ہو''الحوادث'' کی عمومیت اس احتمال کی نفی کرتی ہے۔اس لئے یہ احتمال صرف احتمال کی حد تک ہی ہے۔جس کا کوئی علمی وزن نہیں ہوتا اور مذکورہ حدیث مجمل نہیں بنتی۔

۲. رواۃ احادیثنا

ہماری احادیث کے راوی (راویان احادیث) کی تعبیر سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام زمانہؑ نے منصب نیابت اور حکم رجوع صرف راویان احادیث کو دیا ہے، جبکہ معلوم ہے کہ فقہاء، راویان احادیث سے الگ ہیں۔اس سے ہمارا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔

اس کا جواب بھی واضح ہے، کیونکہ روایت کرنے والا صرف ائمہؑ سے روایت کرتا ہے مگر اس روایت سے استنباط یا مفہوم روایت کی چھان بین کرنا راوی کے دائرہ کار سے خارج ہے۔یہ امر بعید ہے کہ امام زمانہؑ ایسے شخص کو اپنا جانشین بنائیں جو صرف چند احادیث کا راوی ہو اور وہ قوت استنباط اور صحت وسقم کی پہچان سے عاری ہو۔اگر کوئی ایسا راوی ہو جو قوت استنباط کا بھی مالک ہو تو وہ فقیہ کے دائرے میں آتا ہے۔فقیہ سے ہماری مراد وہ شخص ہے جو اسلامی احکام پر مکمل عبور رکھتا ہو۔اس کی مزید وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

۳. حجّتی علیکم

''حجّتی'' اور ''وانا حجۃ اللّٰہ'' کے الفاظ اس حقیقت کو اور واضح طور پر بیان

کرتے ہیں کہ راویان حدیث (فقہاء) کا کتنا اہم مقام ہے۔ چنانچہ امام زمانہؑ تمام لوگوں پر ہر وقت اور ہر مکان میں حجت خدا ہیں اوران کی حجت اور دائرہ کار (ولایت) سے کسی قسم کا کوئی کام خارج نہیں ہے چاہے اجتماعی مسائل ہوں یا انفرادی، سیاسی ہوں یا شرعی، ان تمام امور میں امامؑ کو ولایتِ عامہ حاصل ہے۔ امام زمانہؑ اپنی غیبت کے دور میں اپنے جانشین کو وہی مقام دے رہے ہیں جوان کو حاصل تھا۔ یہ نہایت نامعقول ہے کہ امامؑ نے صرف مسائل شرعیہ بیان کرنے کا حق اپنے جانشین کو دیا ہو اور ولایتِ عامہ کا حق نہ دیا ہو جبکہ خود امام زمانہؑ نہ جانے کتنے عرصہ تک غائب رہیں گے اور لوگوں سے براہ راست ان کا کوئی رابطہ بھی قائم نہیں ہوگا۔

اس مطلب کی تائید دوسری نقل سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں لفظ ''حجتی'' کی بجائے لفظ ''خلیفتی'' مذکور ہے۔ اس کا مفہوم و معنی واضح ہے، یعنی راویان حدیث میرے جانشین ہیں، وہ کس چیز اور کام میں جانشین ہیں؟ ''خلیفتی'' کا لفظ مطلق ہے جس سے وہ تمام امور میں امامؑ کے جانشین ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ درج ذیل امور میں راویان حدیث (فقہاء) کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، کیونکہ حوادث و واقعاتِ زمانہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں لہٰذا رجوع کرنے کے مقاصد بھی مختلف ہیں:

۱۔ شرعی حکم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے فتویٰ اور حلال وحرام دریافت کرنا۔

۲۔ حکم شرعی سے واقف ہونے کی صورت میں ذمہ داری یہ ہے کہ اس قسم کے امور میں فقیہ کی اجازت ضرور لے تاکہ فقیہ کی ولایت کے استعمال سے اس کا حکم شرعی واضح ہو سکے۔ مثلاً ہر مسلمان جانتا ہے کہ موقوفات عامہ (وقف کی جمع) کسی خاص فرد کے لئے نہیں، لیکن اس میں تصرف اور اس کی سرپرستی کرنا اس وقت جائز ہے جب فقیہ عادل نے کسی کو اپنا نمائندہ (وکیل اوقاف) مقرر کیا ہو۔

۳۔ فقیہ کی طرف رجوع کرنا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ وہ اعمال جو کوئی انجام دینا

چاہتا ہو وہ ولی فقیہ کی ولایت کے حصول کے بعد نافذ العمل ہوں یعنی مسلمان حکم شرعی سے واقف ہے لیکن اس حکم کو معاشرے میں نافذ کرنے کی شرط یہ ہے کہ اسے ولی فقیہ خود نافذ کرے یا یہ کام ولی فقیہ کی نگرانی میں انجام پائے۔ لہٰذا اگر یہ اعمال مذکورہ خصوصیات سے عاری ہوں اور کوئی شخص ان کو نافذ بھی کرے تو شرعی نقطہ نگاہ سے ان کی حیثیت کالعدم ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر قضاوت ایک اسلامی فریضہ ہے۔ اسے اسلامی قانون کے مطابق اسلامی معاشرے میں جاری کرنا ضروری ہے مگر ہر ایک اس مقام پر فائز نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ مقام فقیہ کے لئے مخصوص ہے۔ فقیہ کے میسر نہ آنے کی صورت میں فقیہ کا نمائندہ (بوجہ ضرورت) اس اسلامی فریضہ کو انجام دے سکتا ہے اور اس کا فیصلہ جبکہ اسلامی قانون کے خلاف ہونا معلوم نہ ہو، نافذ العمل اور واجب الاتباع ہے۔

اس تیسری قسم میں اسلامی حکومت کا مسئلہ بھی آتا ہے کیونکہ زمانہ غیبت میں اسلامی حکومت کی تشکیل اور اسلامی معاشرے میں اسلامی احکام کے نفاذ کے تمام متعلقہ امور (نظریہ ولایتِ فقیہ کے مطابق) ولی فقیہ سے مربوط ہیں۔ کیونکہ امام زمانہ کے نمائندہ صرف فقہاء جامع الشرائط ہی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس کو ثابت کر رہے ہیں، اس لئے مذکورہ حدیث میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر روداد و واقعاتِ زمانہ میں راویان حدیث (فقیہ اہل بیتؑ) کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس حدیث میں لفظ ''الحوادث'' بطور مطلق و عام استعمال کیا گیا ہے یہ لفظ عام ہے اور ہر حادثہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

لفظ ''فارجعوا'' بھی مطلق ہے اور اسے کسی خاص چیز سے مربوط نہیں کیا گیا، یعنی رجوع کرنے کے موارد و مواقع کو مقیّد و محدود نہیں کیا گیا بلکہ ہر حادثہ (واقعاتِ زمانہ) میں ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس رجوع کے ضمن میں اسلامی حکومت کی تشکیل سے مربوط مسائل بھی شامل ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہے تو یہی ولایتِ عامہ اور ولایتِ فقیہ کے معنی ہیں کہ فقیہ کو مذکورہ

تمام امور میں اختیارات، ولایت اور سرپرستی حاصل ہے۔

یہی معانی لفظ ''حجتی'' یعنی میری حجت سے بھی ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ ان اوصاف کا مالک شخص جب امام زمانہؑ کی حجت ہے تو ہر اس کام میں حجت ہے جس میں خود امام زمانہؑ حجت ہیں۔

حدیثِ پنجم

عمر ابن حنظلہ امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں :

''سألت ابا عبدالله عن رجلين من اصحابنا بينهما منازعة في دين او ميراث فتحاكم الى السّلطان والى القضاة ايحلّ ذٰلک ؟قالَ من تحاكم اليهم في حق او باطل فأنّما تحاكم الى الطّاغوت وما يحكم له فأنّما يأخذ سحتا ان كان حقّاً ثابتاًله. لأنّه اخذه بحكم الطّاغوت وقد امر الله ان يكفر به. وقد قال الله تعالىٰ ''يريدون ان يتحاكموا الى الطّاغوت وقد امروا ان يكفروا به''. قلت فكيف يصنعان؟قالَ :ينظران الى من كان منكم ممن قل روى حديثنا ونظر في حلالنا وحرامنا وعرف احكامنا فليرضوا به حكما فأني قد جعلته عليكم حاكماً،فأذا حكم بحكمنا فلم يقبله منه فأنّما استخفّ بحكم الله وعلينا ردّوالرّادّعلينا الرّادّ على الله،وهو على حدّالشرک بالله.''

''میں نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ ہمارے دو (ہم مذہب) ساتھیوں کے درمیان بوجہ میراث یا دین (قرضہ) اختلاف تھا ہم نے

(اس اختلاف کوختم کرنے کیلئے) سلطان یا قاضی کی طرف رجوع کیا، کیا یہ جائز تھا؟ فرمایا: جس نے بھی ان کی طرف رجوع کیا چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر، اس نے گویا طاغوت کی طرف رجوع کیا اور اس کے فیصلے کے مطابق جو کچھ اخذ کرے گا وہ حرام ہے اگر چہ وہ بذاتِ خود اس کا حق ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس نے بحکم طاغوت (اس کے فیصلے کے مطابق) لیا ہے جس کو مسترد کرنے کا خدا نے حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”لوگ چاہتے ہیں کہ سرکش لوگوں سے فیصلہ کرائیں جب انہیں حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا انکار کریں۔“

میں نے کہا: وہ کیا کریں؟ امامؑ نے فرمایا: وہ دیکھیں کہ تم میں سے جو ہماری حدیث کا راوی ہو، ہمارے بتائے ہوئے حلال وحرام پر اس کی نظر ہو اور ہمارے بیان کردہ احکامات سے واقف ہو تو اس کو اپنا حکم بناؤ! چونکہ میں نے اس کو تم پر حاکم بنایا ہے۔ پس اگر وہ ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ دے اور کوئی اسے قبول نہ کرے تو گویا اس نے حکمِ خدا کو سبک سمجھا اور ہم کو رد کیا۔ اور ہمیں رد کرنے والا اللہ کے حکم کو بھی رد کرنے والا ہے۔ اور یہ اللہ سے شرک کے برابر ہے۔ (وسائل الشیعہ کتاب القضاء الکافی۔ ج ۱ ص ۸۶ /حدیث ۱۰۔ الحیاۃ ج ۲، ص ۲۸۲)

اس روایت سے ولایتِ فقیہ کا ثبوت واضح ہے کیونکہ امامؑ نے فقیہ کو اپنی طرف سے حاکم قرار دیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ مذکورہ روایت سے ولایتِ عامہ ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ روایت صرف قضاوت کے بارے میں ہے جس کی رو سے فقیہ مسلمانوں کے درمیان صرف قضاوت کرنے کا حق رکھتا ہے۔

جواب: خود مذکورہ روایت میں قرینہ موجود ہے کہ اس سے مراد صرف قضاوت نہیں ہے کیونکہ لفظ "سلطان "اور"قضاۃ" دونوں کا ذکر ہوا ہے۔ سلطان کا کام امور سیاست انجام دینا ہے اور قاضی کا کام فصل خصومات اور ایک دوسرے کے درمیان پیدا شدہ اختلافات کو ختم کرنا ہوتا ہے۔

امام زمانہؑ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شیعہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے امور میں سلطان اور قاضی کی طرف رجوع کرے کیونکہ دونوں طاغوت ہیں اور کسی طاغوت کو اپنا حاکم ماننا اسلام کے نقطہ نگاہ سے درست نہیں ہے۔ اس صورت میں شیعوں کا فریضہ کیا ہوگا اور وہ اپنے امور میں کس کی طرف رجوع کریں گے؟ امامؑ جواب میں فرماتے ہیں کہ فقہاء کی طرف رجوع کرو ! کیونکہ وہ میری طرف سے نمائندہ ہیں اور میں نے فقہاء کو تم پر حاکم و قاضی مقرر کیا ہے۔

یہاں پر درحقیقت یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ نے فقہاء کو دونوں مناصب "سلطان" اور "قاضی" تفویض کر دیئے ہیں۔ اس کی دلیل خود روایت کے لفظ "حاکماً" کے موجود ہونے سے ملتی ہے کیونکہ لفظ "حاکماً" لفظ قاضی سے یقیناً مختلف معنی رکھتا ہے (قال قد جعلتُه حاکماً)۔

کہا گیا ہے کہ "حاکماً" سے مراد قاضی ہے کیونکہ لفظ "حاکماً" قاضی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ اشکال بالکل غلط ہے۔ فقہاء کے لئے حق قضاوت بھی ثابت ہے لیکن اس عام لفظ "حاکم" کو صرف قاضی کے معنی میں استعمال کرنا خلاف ظاہر ہے اور اس کے لئے محکم دلیل کی ضرورت ہے، دوسرے عام کو خاص پر اس وقت حمل کیا جاتا ہے جبکہ

ا۔ ہمیں قطع (یقین) اور علم ہو کہ شارع کی طرف سے ایک حکم کے سوا دوسرا حکم ثابت نہیں ہے، لہٰذا جب کوئی لفظ خاص اور عام دونوں کے لئے استعمال ہو تو عام کو خاص پر حمل کیا جاتا ہے۔

۲۔ عام و خاص کے درمیان تضاد و تنافی موجود ہو اور قابل جمع نہ ہو۔

مگر یہاں دونوں صورتیں بنتی ہیں، اور عام وخاص دونوں فقیہ کے لئے ثابت ہیں عام یعنی "حکومت عامہ"، خاص یعنی "قضاوت"۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ حکم وحاکم قضاوت کے معنی تک محدود نہیں ہے جیسا کہ ارشاد خداوند کریم ہے:

"یَادَاوُودُ اِنَّاجَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْأَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ."

"(ہم نے کہا) اے داؤود! ہم نے تم کو زمین میں (اپنا) نائب قرار دیا تو تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو۔" (ص ۲۶)

۳۔ اسلامی روایات خاص طور پر روایات ائمہؑ کے مطابق لفظ "حکام جور" سلطان جابر کے معنی دیتا ہے اس بناء پر حاکم، سلطان کے معنی میں ہے اور یہ حاکم ظالم وجابر بھی ہوسکتا ہے اور عادل ومنصف بھی۔

۴۔ اسلام میں حاکم اور قاضی کا منصب الگ الگ نہیں ہے بلکہ حاکم اعلیٰ قاضی بھی ہے۔ اس کی دلیل خود رسول اکرمؐ کی ذات ہے جو حاکم بھی تھے اور قاضی بھی۔ آپؐ کے بعد امیر المومنینؑ بھی بیک وقت دونوں مناصب پر فائز تھے۔

حدیثِ ششم: ابو خدیجہ امام صادق سے روایت کرتے ہیں۔

"قال لی ابو عبد الله (ع): ایّاکم أن یحاکم بعضکم بعضا الیٰ اهل الجور ولاکن انظروا الیٰ رجل منکم یعلم شیئاً من قضآئنا (قضایانا) فاجعلوه بینکم فأنّی قد جعلتُه قاضیا فتحاکموا الیه۔"

"ابو خدیجہ کہتا ہے کہ امام صادقؑ نے مجھ سے فرمایا: خبردار! تم میں کوئی بھی اہل جور کی طرف رجوع نہ کرے بلکہ اپنے میں سے کسی کو ہمارے

امورات (احکام) کو جانتے ہوئے پاؤ تو اسے اپنے درمیان قاضی بنالو
کیونکہ میں نے اسے قاضی مقرر کر دیا ہے پس اس کی طرف رجوع
کرو۔"(وسائل الشیعه باب قضا)

اس پر یہ اشکال ہوا ہے کہ روایت میں لفظ "قاضی" استعمال ہوا ہے جس کے اختیارات محدود ہوتے ہیں، لہٰذا اس سے ولایتِ عامہ ثابت نہیں ہوتی۔

قضاوت سے مراد صرف وہ خاص معنیٰ نہیں بلکہ دراصل اس کے معنی کسی چیز کو قطع وابرام کرنے کے ہیں، قاضی پر بھی لفظ "قاضی" کا اطلاق اس لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ اختلاف کو ختم کرتا ہے۔

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط"

"نہ کسی ایمان دار مرد کو یہ مناسب ہے نہ کسی ایمان دار عورت کو کہ جب خدا اور اس کا رسولؐ کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے اس کام (کے کرنے یا نہ کرنے) کا اختیار ہو۔"(احزاب ۳۶)

اس قضاوت سے مراد عام معنیٰ ہیں نہ کہ معنیٰ خاص۔ اس کے علاوہ بعض روایات میں لفظ "سلطان جائر" اور بعض روایات میں "اهل الجور" ذکر ہوا ہے کہ جو معنیٰ اعم پر دلالت کرتا ہے، دوسرے یہ کہ نزاع صرف ایک معنیٰ معروف میں منحصر نہیں کہ نزاع صرف قاضی سے مربوط ہو بلکہ نزاع کی بہت سی قسمیں ہیں جو سیاسی، اجتماعی، دینی، حقوقی اور ہر شعبہ حیات سے مربوط ہیں۔ ان تمام نزاع کو حل کرنے کے لئے مسلمانوں پر فرض ہے کہ قرآن وسنّت رسول اکرمؐ کی طرف رجوع کریں۔ ائمہ اہل بیتؑ کی طرف رجوع کرنا قرآن وسنت نبویؐ کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہے کیونکہ ائمہ معصومینؑ قرآن وسنت رسولؐ کے مفسر ہیں، اس بناء پر آیہ شریفہ

''فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ''

''اور اگر تم کسی بات میں جھگڑو تو اس امر میں خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔''(النسآء ۵۹)

میں مرجع حل اختلاف کو صرف قرآن وسنت میں منحصر کر دیا ہے، ائمہؑ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ جو بھی بیان کرتے ہیں وہ اللہ اور رسولؐ سے لیا ہوتا ہے لہٰذا ائمہؑ کا ذکر الگ طور پر نہیں کیا گیا، اس بناء پر امام زمانہؑ کی مراد شیعوں کے لئے عصر غیبت میں حکم کا تعین کرنا ہے کہ وہ سلطان جابر اور قاضی جابر کے سامنے کیا کریں؟

جواب: وہ فقہاء کی طرف رجوع کریں کیونکہ فقیہ کو تمام اختلافات دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حدیثِ ہفتم

''عن ابی خدیجه ،قال :بعثنی ابو عبدالله(ع)الیٰ اصحابنا فقال :قل لهم ايّاكم اذا وقعت بينكم خصومة ،او تداری فی شیء من الأخذ والعطآء،ان تحاكموا الیٰ احد من هؤلآء الفسّاق اجعلوا بينكم رجلاً قد عرف حلالنا وحرامنا فأنّی قد جعلتُه عليكم قاضياً وايّاكم ان يخاصموا بعضكم بعضاً الی السُّلطان الجآئر ''(وسائل الشیعہ ۔ج ۱۸/ص ۱۰۰)

''ابو خدیجہ کہتے ہیں: مجھے امام صادقؑ نے اپنے لوگوں کی طرف بھیجا اور فرمایا لوگوں سے کہو کہ ان میں جب کوئی نزاع پیش آئے تو ان فاسقوں کی طرف رجوع نہ کرو! ایسے فرد کو اپنے درمیان (حاکم) بناؤ جو ہمارے حلال وحرام سے واقف ہوں۔ ایسے شخص کو میں نے تمہارے لئے قاضی بنایا ہے۔ خبردار! جو تم جابر بادشاہ سے اپنے فیصلے کراؤ۔''

اب ہم اس حدیث کے چند نکات پر بحث کرتے ہیں:

۱. اذا وقعت بینکم خصومة

خصومت سے مراد ہر وہ نزاع ہے جو شیعوں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ کبھی یہ نزاع واختلاف عدالتی ہوتا ہے جیسا کہ روایت کا ظاہر ہے اور کبھی بوجہ معیار وملاک، باقی تمام اختلافات بھی اس ضمن میں آسکتے ہیں۔ ان اختلافات میں سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور نظریاتی بھی ہیں۔

۲. قد عرف حلالنا و حرامنا

دوسرا لفظ ''قد عرف حلالنا و حرامنا'' یعنی حلال وحرام سے واقف ہو، یعنی اسلام شناس ہو۔ باہمی اختلافات دور کرنے کا حق صرف اس کو پہنچتا ہے جو اسلام کے قوانین واصول سے واقف ہوتا کہ ہر قدم، کلام اور فیصلہ حکم خدا کے مطابق ہو۔

۳. الی السّلطان الجائر

سلطان کے معنی قاضی کے نہیں کیونکہ لفظ ''سلطان'' جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس سے تبادر ذہنی صرف بادشاہ اور حاکم ہوتا ہے۔ اس سے کبھی بھی (قرینہ کے بغیر) قاضی ذہن میں نہیں آتا، مگر یہاں مخاصمہ واختلاف کا قضیہ سلطان جائر کے ذریعے حل کرانے سے روکا گیا ہے۔

اس تعبیر سے یہ نکتہ ذہن میں آتا ہے کہ حکومت ظالم کے عہد میں اس کی عدالت میں جانا اور شکوہ کرنا حرام ہے، کیونکہ ایسا کرنا طاغوت کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا امامؑ نے فرمایا ''الی السّلطان الجائر'' اور یہ نہیں فرمایا کہ ''الی القاضی الجائر'' کیونکہ اس سے احتمال اور توہم ہوسکتا تھا کہ شاید قاضی کی عدالت اور فیصلہ کی طرف رجوع کرنا حرام نہ ہو۔ صرف حاکم ظالم کی طرف رجوع کرنا حرام ہو۔ امامؑ نے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ قاضی کی طرف رجوع کرنا عین سلطان جائر کی طرف رجوع کرنا ہے، جس طرح جابر سلطان کی طرف رجوع کرنا حرام ہے اسی طرح اس کے مقرر کردہ قاضی سے

رجوع کرنا بھی جائز نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ معقول بات نہیں کہ امامؑ شیعوں کو ان دونوں کی طرف رجوع کرنے سے تو منع کردیں اور اپنا جانشین صرف قاضی کے مقام پر مقرر کردیں اور حاکم کے مقام پر کسی کو بھی مقرر نہ کریں۔

حدیثِ ہشتم: حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

''العلمآء حکام علی النّاس .''

''علماء لوگوں پر حاکم ہیں۔'' (الحیاۃ ج ۲/ص ۲۸۱)

حدیثِ نہم: امام صادقؑ فرماتے ہیں:

''الملوک حکّام علی النّاس والعلمآء حکّام علی الملوک.'' (الحیاۃ ج۲۔ص۲۸۱)

''بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوتے ہیں اور علماء بادشاہوں پر حاکم ہوتے ہیں۔''

اس حدیث سے مقام و منزلت علماء اور ان کی اہلیت کا پتہ چلتا ہے کہ سیاہ وسفید پر حکومت کرنے کا حق صرف علماء کو پہنچتا ہے، اگر کہیں کوئی بادشاہ ہو بھی تو علماء کی زیر نگرانی اور علماء کی جانب سے حکومت کرنے کی اجازت ملنے پر اس کی حکومت درست ہوگی۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ علماء کے لئے خود براہ راست حکومت کرنا ضروری نہیں، بلکہ علماء کا کوئی نمائندہ بھی حکومت کرسکتا ہے جس کا ذکر روایت میں ''ملوک'' کے نام سے کیا گیا ہے۔

حدیثِ دہم: حضرت امام حسینؑ فرماتے ہیں:

''مجاری الأمور والأحکام علیٰ ایدی العلمآء باللّٰہ، الأمنآء علیٰ حلالہ وحرامہ.''

''تمام امور اور احکام الٰہی ان علماء کے ذریعے نافذ ہوں جو اللہ کی معرفت رکھنے والے اور خدا کے حلال وحرام کے امین ہیں۔'' (الحیاۃ۔ج۲/ص۲۸۱)

اس حدیث میں دو لفظ کا ذکر باہم ہوا ہے: ۱ امور ۲. احکام

احکام سے مراد احکام الٰہی ہیں، لیکن امور کا مفہوم اس معنی سے زیادہ وسیع ہے یعنی زندگی کے تمام امور خواہ وہ سیاسی ہوں یا اقتصادی، تربیتی ہوں یا اجتماعی۔ وہ فقیہ اور علمائے اسلام سے وابستہ ہیں، اسی معنی کا نام ولایت، زعامت اور سرپرستی ہے۔

حدیثِ یازدہم: رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"علمآء امتی کأنبیآء بنی اسرآئیل" (الحیاۃ۔ ج ۲ ص ۲۸۰)

"میری امت کے علمائے بنی اسرائیل کے انبیاءؑ کی مانند ہیں۔"

یہ حدیث علماء کی اہمیت اور مقام بیان کرنے کے لئے کافی واضح ہے اور محتاج تشریح نہیں، بہرحال مختصر یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل کو اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنی امت کی زعامت دینی، ولایتِ عامہ اور سرپرستی کے حاصل ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور دین خدا کی نگہداری اور حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی تھی۔

اس دور میں یعنی رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد یہ ذمہ داری علمائے امتِ مسلمہ پر عائد ہوتی ہے اور دین کی حفاظت اور اس کے نفاذ کی ولایت، علماء کو حاصل ہے اور انہی اختیارات کا نام ولایت فقیہ یعنی علماء کی سرپرستی ہے۔

حدیثِ دوازدہم: امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"...العلمآء ورثة الأنبیآء. وذٰلک ان الأنبیآء لم یورثو ادرھما ولا دیناراً وانّما اورثوا احادیث من احادیثھم، فمن اخذ بشیء منھا فقد اخذ حظاً وافراً فانظروا علمکم ھٰذا عمّن تأخذونه إفان فینا اھل البیتؑ فی کل خلف، عُدُولا ینفون عنه تحریف الغالین، وانتحال المبطلین، وتأویل

الجاھلین۔"

"علماء، انبیاءؑ کے وارث ہیں اور یہ اس لئے ہے کہ انبیاءؑ نے کبھی درہم ودینار میراث میں نہیں چھوڑے بلکہ انہوں نے جو ترکہ چھوڑا ہے وہ احادیث ہیں۔ پس جس نے ان احادیث میں سے کچھ حاصل کرلیں تو گویا کہ اس نے بہت کچھ حاصل کرلیا، پس تم یہ دیکھو کہ اپنا علم کس سے حاصل کر رہے ہو۔۔۔؟" (الحیاۃ۔ ج ۲/ص ۲۸۰)

حدیثِ سیزدہم: امام حسن العسکریؑ فرماتے ہیں۔

"فأمّا من کان من الفقهآء صآئناً لنفسه، حافظاً لدینه مخالفا علیٰ هواه مطیعاً لأمر مولاه فللعوام ان یقلّدوه و ذلک لایکون الّا بعض فقهآء الشیعة، لا جمیعهم."

"فقہاء میں سے جب کوئی ایسا فرد ہو جو اپنے نفس کو (ہلاکت سے) بچائے، اپنے دین کی حفاظت کرے، اپنی خواہشات کی مخالفت کرے، اپنے مولا کے حکم کی اطاعت کرے تو عوام پر فرض ہے کہ وہ اس کی تقلید کریں۔ فقہائے شیعہ میں کچھ لوگ ایسی صفات کے حامل ہوتے ہیں نہ سب۔" (الحیاۃ۔ ج ۲/ص ۲۸۲)

حدیثِ چہاردہم: حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"انّ اولی النّاس بالأنبیآء اعلمهم بما جآؤُا به."

"تمام لوگوں میں انبیاءؑ کے زیادہ نزدیک وہ شخص ہے، جو ان کی تعلیمات سے زیادہ آگاہ ہو۔" (نہج البلاغہ، انتظار الامام۔ ص ۱۱۶)

حدیثِ پانزدہم: حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"ایّھاالنّاس انّ احق النّاس بھٰذاالأمر اقواھم علیہ اعلمھم بأمر اللّٰہ فیہ."

"اے لوگو! تمام لوگوں میں اس خلافت کا اہل وہ ہے جو اس (نظم ونسق کے برقرار رکھنے) کی سب سے زیادہ قوّت وصلاحیت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام کو سب سے زیادہ جانتا ہو" (نھج البلاغہ. خ۱۷۳، صبحی صالحی ص۲۴۷)

حدیثِ شانزدہم: امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

"النّاس ثلاثۃفعالم ربّانی و متعلّم علیٰ سبیل النّجاۃ وھمج رعاع اتباع کل ناعق یمیلون کل میل مع کل ریح ،لم یستضیئوا بنور العلم ولم یلجو الیٰ رکن وثیق........یا کمیل اِھلک خزّان الأموال وھم احیآءٌ والعلمآء باقون ما بقی الدّھر اعیانھم مفقودۃ، وامثالھم فی القلوب موجودۃ ان ھھنا لعلمآء جما.....اللّھمّ بلیٰ الا تخلوالأرض من قآئم اللّٰہ بحجّۃ ،امّا ظاھراً مشھوراً امّا خآئفا مغموراً لئلّا تبطل حجج اللّٰہ وبیّناتہ وکم ذا ؟واین اولٰئک ؟اولٰئک واللّٰہ الأقلّون عدداً......اولٰئک خلفآء اللّٰہ فی ارضہ والدّعاۃ الیٰ دینہ .آہ! آہ اِشوقاً الیٰ روئیتھم ......"

"لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ایک عالم ربانی، دوسرا متعلم کہ جو نجات کی راہ پر برقرار ہے۔اور تیسرا عوام الناس کا وہ پست گروہ کہ جو ہر پکارنے والے کے پیچھے ہو لیتا ہے اور ہر ہوا کے رخ پر مڑ جاتا ہے، نہ انہوں نے

نورِعلم سے کسب ضیاء کیا نہ کسی مضبوط سہارے کی پناہ لی۔

اے کمیل! مال اکٹھا کرنے والے زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہیں اور علم حاصل کرنے والے رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں، بیشک ان کے اجسام نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں مگر ان کی صورتیں دلوں میں موجود رہتی ہیں۔۔۔۔

ہاں! مگر زمین ایسے افراد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خدا کی حجّت کو برقرار رکھتے ہیں، چاہے وہ ظاہر و مشہور ہوں یا خائف و پنہاں۔تا کہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں اور وہ ہیں ہی کتنے؟ اور کہاں پر ہیں؟ خدا کی قسم وہ تو گنتی میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔

یہی لوگ تو زمین میں اللہ کے نائب اور اس کے دین کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ ہائے ان کی دید کے لئے میرے شوق کی فراوانی!" (نهج البلاغه باب الحكم ۱۴۷)

مولائے متقیان علیہ السلام کا یہ کلام ہمارے دعویٰ کی واضح دلیل ہے کہ فقیہ ہی دین کی نگہداری اور لوگوں کے امور میں تصرف کرسکتے ہیں۔

بطور اختصار کلام حضرت امیر المومنینؑ میں سے چند جملے بطور نمونہ علیٰحدہ طور پر ذکر کئے جاتے ہیں:

۱. عالم ربّانی.

۲. لاتخلو الأرض من قائم اللّٰہ بحجّة.

۳. امّا ظاهراً مشهوراً، وامّا خآئفاً مغموراً.

۴. لحفظ اللّٰہ بهم حجّة.

۵. حتیٰ دعوها نظآئرهم ويزرعوها في قلوب اشباههم.

۶۔اولئک خلفآء اللّٰہ فی ارضہ والدّعاۃ الیٰ دینہ

ان تمام جملوں کو باہم جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں ایسے عالم ربانی کا ہونا ضروری ہے جس کے تمام افعال و کردار اللہ کے لئے ہوں۔ کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہئے کہ عالم ربانی سے مراد صرف ائمہ معصومینؑ ہیں اور ان کے علاوہ کوئی بھی اس مقام پر فائز نہیں ہوسکتا۔ اگر چہ یہ سو فیصد درست ہے کہ عالم ربانی کے سب سے اعلیٰ اور اجلیٰ مصداق ائمہ معصومینؑ ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا صرف وہی اس کے مصداق ہیں اور ان کے علاوہ کوئی بھی اس کا مصداق نہیں بن سکتا؟ کیا یہ معنی مراد ہے کہ ان کے بعد کوئی مرتبہ علمی و ربانی درست نہیں؟ اور سارے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں؟ امام زمانہؑ کی غیبت کے زمانے میں حجت الٰہی کہاں ہے؟

بہر حال مسلمانوں کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کرنے والے درحقیقت ان کے امین ہیں۔ اور انہیں ایسے اوصاف کا مالک ہونا چاہئے جو حضرتؑ نے بیان فرمائے ہیں۔ اور یہ صفات فقیہ جامع الشرائط کے علاوہ کسی اور پر منطبق نہیں ہوتیں، اور اسی کے ذمے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی اور حل و فصل کا کام سپرد کر دیا گیا ہے۔

گزشتہ مطلب کی تائید اس حدیث مروی سے بھی ہوتی ہے:

”ولو من یبقیٰ بعد غیبت قآئمنا من العلمآء الداعین الیه والدالّین علیه .... الیٰ ان قال :ما بقی احد الّا ارتدّ عن دین اللّٰه اولئک هم الأفضلون عنداللّٰه عزّ وجلّ ....“

”اگر قائم آل محمدؑ کی غیبت میں پرہیزگار اور متقی علماء جو (اللہ کی طرف) ہدایت و رہنمائی کرتے ہیں، موجود نہ ہوتے تو۔۔۔۔کوئی بھی دین خدا پر عمل پیرا نہ ہوتا اور دین خدا کو ترک کر دیا جاتا۔ (لہٰذا وہ) ہادیان و رہبران حق (علمائے عظام) خدا کے نزدیک بافضیلت اور افضل ہیں۔۔۔۔“ (تفسیر الامام الحسن العسکریؑ)

شرائطِ فقیہ

گزشتہ باب میں عقل ،قرآن اور احادیث کی روشنی میں ولایتِ فقیہ کا جائزہ لیا گیا،اصول مذہب اور اسلام کے اہداف ومبانی سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کا کوئی فقیہ وعادل حاکم ہونا ضروری ہے تا کہ مسلمانوں کی سیاسی ،سماجی اور معاشی ضروریات پوری ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر طرف سے نظریاتی اور سرحدی حملوں سے محفوظ رہ سکیں اور حکومت اسلامیہ (حکومت قرآن) قائم ہوجائے۔

پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ زمانہ غیبت کبریٰ میں فقیہ کے علاوہ کوئی بھی فرد مسلمانوں کا زمام دار نہیں ہوسکتا۔اب اس باب میں ہم یہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے کہ فقیہ حاکم کی کیا شرائط ہیں؟ اور فقیہ کن شرائط کے تحت مسلمانوں کا ولی اور اولی الامر بن سکتا ہے؟

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس کے قانون میں ملک کا سربراہ بننے کے لئے کوئی شرط موجود نہ ہو اور ہر شخص ملک کا سربراہ بن سکتا ہو۔مثلاً کیمونسٹ اور سوشلسٹ ممالک میں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ ان کے نظریات سے اختلاف رکھنے والا یا ان کے معیار سے کم واقفیت رکھنے والا ان کا سربراہ بن جائے اور نہ ہی وہ کسی ایسے فرد کو اپنا سربراہ بنائیں گے جو ان کے معیار امانت،سابقہ حالات زندگی اور قانون کی وفاداری سے ہم آہنگ نہ ہو۔

اگر تاریخی لحاظ سے مسئلہ حکومت اور سربراہ کا جائزہ لیا جائے تو تاریخ بتاتی ہے کہ ایک عوامی حکومت جس کے پیش نظر رفاہ عامہ بھی ہو اور ہر ایک شہری کی سعادت،حریت اور حقوق کی

پاسداری بھی۔اس کے سربراہ کے لئے ان شرائط پر پورا اترنا لازمی ہے۔

افلاطون کے نزدیک سربراہ مملکت کو صرف فلاسفر ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک اپنے پیدائشی، اجتماعی اور سیاسی حقوق کا مالک بن سکے۔

نظام اسلامی میں بھی ہر کوئی سربراہ مملکت نہیں بن سکتا بلکہ صرف وہ شخص قابل اطاعت اور مسلمانوں کے امور میں دخل دینے کے قابل ہے جو روح اسلام سے ہم آہنگ ہو، اسلام کے اہداف اور اغراض ومقاصد کو معاشرے میں نافذ کرنے اور ہر ایک کو اسلام کے تعین کردہ حقوق کی ضمانت دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، عدالت اجتماعی کو عام کرنے اور زندگی کے ہر پہلو پر اس کی تنفیذ کے لئے صدق دل سے کوشاں ہو۔

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ."

"ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح و روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔" (الحدید ۲۵)

اس لئے اسلامی اہداف ومقاصد کو اسلامی معاشرے میں نافذ کرنے کے لئے ان شرائط کا رہبر میں ہونا ضروری ہے۔

ا۔ علم

فقیہ کی پہلی شرط یہی ہے کہ اسے اسلام کا علم ہو یعنی وہ اسلام کے انفرادی واجتماعی احکام وقوانین سے واقف ہو تاکہ اسلامی احکام کو عملی جامہ پہنا سکے۔ دوسری طرف مذکورہ تمام دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ ولایت اور زعامت صرف فقیہ کو حاصل ہے اور مقام فقاہت پر ہر وہ شخص فائز ہو سکتا ہے جس نے اسلام کو اس کے اصل منابع اور مدارک سے درک کیا ہو، ورنہ وہ فقیہ

نہیں بن سکتا۔

اب ہم فقیہ کے مفہوم کو بیان کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ فقیہ سے مراد کون ہے؟

مفہوم فقیہ کا غلط تصور

فقیہ کے معنی کے متعلق بحث کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہمارے نزدیک فقیہ کا مفہوم بالکل بدل کر رہ گیا ہے اور اب اس مفہوم کا دائرہ اتنا تنگ کر دیا گیا ہے کہ اسلام کے وسیع مفہوم کا صرف ایک جُزو اس میں آ سکتا ہے اور فقیہ کا اطلاق ان افراد پر کیا جاتا ہے جو اسلام کے صرف ایک پہلو سے واقف ہوں۔ مثلاً اس دور میں فقیہ وہ ہے جو اصول فقہ اور ابواب فقہ پر عبور رکھتا ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اصول فقہ اسلامی علوم میں شمار ہوتا ہے؟ موجودہ اصول فقہ اسلام کو سمجھنے میں کہاں تک مدد دیتا ہے؟ اور موجودہ موشگافی بحث کہاں تک ضروری ہے؟ آیا اصول فقہ میں اٹھائے گئے تمام مسائل استنباط احکام کے لئے ضروری ہے؟ اگر غیر ضروری مسائل کو حذف کر کے صرف ضروری مسائل کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جائے تو کہاں تک اسلام اور قانون اسلام ناقص رہ جاتا ہے؟

درحقیقت اصول فقہ پر حد سے زیادہ تحقیق ہو چکی ہے اور اصول فقہ، فقہ کا مقدمہ ہونے کی حد سے نکل کر ایک مستقل علم بن چکا ہے جو صرف ان افراد کو پڑھنا چاہئے جو علم برائے علم اور فن برائے فن پڑھتے ہیں اور یہ ان افراد کے لئے بالکل بے سود ہے جو اصول فقہ کو فقہ کے مقدمے کے طور پر پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہاں! اصول فقہ کے ضروری قواعد اور لازمی مسائل کو تمہیداً پڑھنا ضروری ہے تا کہ فقہ کی بنیاد بن سکے۔ بہر حال موجودہ دور میں فقہ کا ایک اہم ستون اور عنصر اصول الفقہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسرا اہم ستون وہ مسائل ہیں جو عموماً پانچ سو آیات قرآن پر مشتمل ہیں اور ان احکام کی تفسیر و تشریح کے طور پر "وسائل الشیعہ" سامنے موجود ہے، بقول

آیت اللہ شہید مطہریؒ ''فقیہ وہ نہیں ہے جو ''جواهر الکلام'' اور'' وسائل الشیعه'' کو دیکھ کر پے در پے فتویٰ دے''۔

اس مفہوم کے مطابق وہ شخص فقیہ جامع الشرائط نہیں ہے جو اسلام کے تمام پہلوؤں کا علم نہ رکھتا ہو۔ یہ مفہوم ایک جدید اصطلاح ہے جو اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ اسلام کا دستور قرآن ہے اور جو شخص قرآن کے احکام و دستورات سے واقف نہ ہو یعنی جسے روح اسلام سے مکمل آشنائی نہ ہو اسے کامل فقیہ نہیں بلکہ ناقص عالم کہا جائے گا۔ جب کوئی شخص خود اسلام کے قوانین سے پوری طرح واقف نہیں ہوگا تو وہ انہیں معاشرے میں کس طرح نافذ کر سکتا ہے؟

اب ہم فقیہ کی تعریف کے ضمن میں اس کے مثبت پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔

فقیہ کا صحیح مفہوم

اسلامی روایات، اسلامی روح کی بقاء اور اس کی جامعیت کو مدنظر رکھنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فقیہ جامع الشرائط، جو کہ مسلمانوں کا رہبر اور سربراہ بھی ہے، وہی ہو سکتا ہے جو روح اسلام سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ ہر دور کے مسائل کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو۔ اپنی رہبری میں لوگوں کی مشکلات کے حل اور سعادت ابدی کی طرف ان کی ہدایت کرے۔

اب فقیہ کی تعریف مختلف بیانات سے پڑھ لیجیے۔

معصوم کی نگاہ میں

۱۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

''فأنّا لا نعدّ الفقیه منهم فقیهاً حتیٰ یکون محدّثاً فقیل له: اوَ یکون المؤمن محدّثاً؟ قالَ: یکون مفهّماً. المفهّم المحدث''

''ہم ہرگز ان فقہاء کو فقیہ کا درجہ نہیں دیتے جو محدث نہ ہو۔ پوچھا گیا: کیا

مومن محدث ہو سکتا ہے؟ فرمایا: بافہم ہوتا ہے۔ بافہم کو محدث کہا جاتا ہے۔" (الحیاۃ . ج ۲ / ص ۳۵۹)

۲۔ امام باقرؑ کا ارشاد ہے:

"انّ الفقیہ، الزّاھد فی الدّنیا، الرّاغب فی الآخرۃ، المتمسّک السّنّۃ النّبیّ "

"بے شک فقیہ وہ ہے جو دنیا میں زاہد، آخرت کا راغب اور سنت نبیؐ سے متمسک ہو۔" (الحیاۃ ج ۲ / ص ۳۵۹)

۳۔ حضرت امام محمد باقرؑ اپنے جدّ بزرگوار حضرت امیرالمومنینؑ سے روایت کرتے ہیں

"الا اُخبرکم بالفقیہ حقّاً؟ من لم یقنط النّاس من رحمۃاللّٰہ ولم یترک القرآن رغبۃً عنہ الیٰ غیرہ "

"کیا میں تمہیں حقیقی فقیہ سے آگاہ کروں؟ (فقیہ) وہ ہے جو لوگوں کو رحمت خدا سے مایوس نہ کرے اور غیر قرآن کی طرف مائل ہو کر قرآن کو ترک نہ کرے۔" (الحیاۃ ج ۲ / ص ۳۵۹)

۴۔ امام باقرؑ کا ارشاد ہے:

"الّا نعدّ الرّجل فقیھاً عالماً حتّیٰ یعرف لحن القول."

"ہم کسی آدمی کو اس وقت تک فقیہ عالم شمار نہیں کرتے جب تک وہ ہمارے اقوال کی تہہ تک نہ پہنچ جائے۔" (الحیاۃ ج ۲ / ص ۳۸۸)

مفہوم فقیہ اور فقہائے اسلام

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:۔

"ویطلق الفقیہ غالباً فی الأخبار علی العالم العامل الخبیر

یعیوب النّفس و آفاتها التّارک للدّنیا الزّاهد فیها الرّاغب
الی ما عنده تعالیٰ ،من نعیمه و قربه و وصاله."

"اخبار اہل بیتؑ کے مطابق لفظ فقیہ کا اطلاق عموماً اس شخص پر ہوتا ہے جو عالم باعمل، نفس کے عیوب (ناپسندیدہ خواہشات) اور ان کی آفات سے آگاہ ہو، تارک الدنیا ، دنیا میں زاہد، اللہ کے پاس موجود نعمتوں کا خواہاں اور اللہ کے قرب ووصال کی طرف راغب ہو۔" (الحیاۃ۔ ج ۲ ص ۳۸۰)

جناب علامہؒ نے اس عبارت میں علم باعمل کے علاوہ اخلاقی عروج وکمال کا بھی ذکر فرمایا ہے، جس کا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا۔

علامہ طباطبائیؒ فقیہ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"در صدر اسلام فقیه به کسی گفته می شد که به همه علوم دینی در اصول و فروع و اخلاق باشد .نه تنها مسائل فروع دین،چنانچه اکنون مصطلح است "

"صدر اسلام میں لفظ فقیہ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا تھا جو اصول وفروع دین سے مربوط تمام علوم پر حاوی ہو، اخلاق اسلامی سے آراستہ ہو، فی زمانہ رائج مفہوم کے برخلاف اس کا اطلاق صرف فروع دین کے مسائل جاننے والے پر ہوتا ہے۔" (معنویت تشیع مقالات ولایتِ فقیہ در رہبری۔ص ۷٦)

مفکرِ اسلام حضرت آیت اللہ شہید الصدرؒ فرماتے ہیں :۔

"نائب الامام و المجتهد المطلق العادل الاعلم بمتطلبات النیابة "

"نائب امام زمانہؑ وہ مجتہد مطلق ہے جو عادل، اعلم اور نیابت کے تقاضوں سے آگاہ ہو"

آپؒ مزید فرماتے ہیں:

" وھٰکذا تخرج من ذٰلک بأن الشّهید سوآء کان نبیّاً او اماماً او مرجعاً. یجب ان یکون عالماً علیٰ مستویٰ استیعاب الرّسالة، وعادلاً علیٰ مستویٰ الالتزام بها و التّجرّد عن الهویٰ فی مجال حملها، وبصیراً بالواقع المعاصر له، و کفوءٌ فی ملکاته و صفاته النّفسیّة "

"۔۔۔۔سابقہ مباحث سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ شہید[1] چاہے نبی ہو یا امام یا مرجع (مجتہد) اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی علمی سطح اس قدر بلند ہو کہ وہ رسالت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ عملی میدان میں عادل ہو، اس کے حمل اور اٹھانے کے موقع پر نفسیاتی خواہشات سے بالا ہو، زمانے کے حالات سے آگاہ ہو، ذاتی صفات اور اخلاقی کمالات کے اعتبار سے اس منصب کے لئے سزاوار ہو" (خلافۃ الانسان وشہادۃ الانبیاءؑ۔ ص۲۷)

اس کے علاوہ آیت اللہ شہید صدرؒ فرماتے ہیں:

"ومن الضّروری ان یلاحظ ان المرجع لیس شهیداً علی الأمّة فقط بل هو جزءٌ منها ایضاً وهو عادةً من اوعیٰ افراد الأمّة و اکثرها عطاءٌ او نزاهة."

[1] شہید صدر مرحومؒ کی اصطلاح میں شہید سے مراد، پوری امت کی نگرانی کرنے والے اور اس پر نگران سے ہے جس کا اولین مصداق انبیائے الٰہی پھر ان کے بعد اوصیاء اور پھر علمائے اعلام ہیں۔

''یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مرجع (مجتہد) امت (اسلامیہ) پر صرف شہید نہیں ہے بلکہ وہ اس کا ایک حصہ بھی ہے اور وہ (مرجع) عموماً امت کے ان افراد میں سے ہوتا ہے جو سمجھدار، زیادہ خدمت گزار اور زیادہ بے داغ وغیرہ ہوں۔'' (خلافۃ الانسان وشہادۃ الانبیاء۔ص۵۵)

''المرجع هو الأنسان الّذی اکتسب من خلال جهدیّ بشریّ ومعناه طویلة الأمة، استیعاباً حیّاً وشاملاً ومتحرّکاً للأسلام ومصادره وورعاً معمّقاً بروض نفسه علیه حتّیٰ یصبح قوّة تتحکّم فی کلّ وجوده وسلوکه ورعیاً اسلامیّاً رشیداً علی الواقع وما تزخر به من ظروف وملابسات لیکون شهیداً علیه''

''مرجع (مجتہد) وہ انسان ہے جس نے اپنی بشری کوشش، سعی مسلسل اور طاقت کے ذریعے، اسلام اور اسلام کے حقیقی منابع (قرآن وسنت) کے متعلق ہمہ گیر، زندہ اور باشمولیت (عملی) اور متحرک علم ومعلومات حاصل کی ہوں اور اپنے نفس کو ریشہ دار تقویٰ وپرہیزگاری کا عادی بنالیا ہو۔ یہاں تک کہ (یہ تقویٰ) ایک مضبوط طاقت بن گیا ہو جو اس کے وجود کے تمام پہلوؤں اور سلوک کے تمام جوانب پر حکومت کرتا ہو اور وہ اسلامی عمیق اور سمجھ کا مالک بن گیا ہو جس سے وہ موجودہ حالات پر قابو پاسکے تاکہ وہ شہید اور نگران ہو سکے۔'' (خلافۃ الانسان وشہادۃ الانبیاءؑ ۔ص۲۳)

مذکورہ بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ نائب امام فقیہ ہی ہوسکتا ہے اور ولایتِ فقیہ بھی اسی کو حاصل ہوگی۔

اس شرط کو درحقیقت قرآن حکیم کی اس آیت سے لیا گیا ہے،

"وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ."

"اور (مال میں نہ سہی) مگر علم اور جسم کا پھیلاؤ تو اسی خدا نے زیادہ فرمایا ہے۔" (البقرۃ۔۲۴۷)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ولی فقیہ کے لئے اعلم ہونا بھی شرط ہے؟ یعنی ولایت وزعامت کی پہلی شرط میں اعلمیت کا دخل ہے یا نہیں؟ اعلم سے مراد ایسا شخص ہے جسے استنباط احکام شرعیہ میں تو سب سے زیادہ مہارت حاصل ہو مگر سیاسی بصیرت اور تدبیر امور مملکت کی صلاحیت اس میں نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ولایتِ فقیہ کے مذکورہ دلائل میں اعلمیت کی شرط کا کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا بلکہ باقی شرائط کے ساتھ علم کی ضرورت کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اعلمیت کا مفہوم بھی موارد کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔

(i) قاضی کی اعلمیت۔

(ii) مفتی کی اعلمیت

(iii) حاکم کی اعلمیت

(i) قاضی کی اعلمیت

قاضی کی اعلمیت سے مراد یہ ہے کہ اسے استنباط احکام میں مہارت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ قضاوت کے موقع پر تطبیق کرنے کی بھی مہارت حاصل ہو۔

یہ شرط ان علماء کے نزدیک ہے جو قاضی کا مجتہد اور اعلم من فی البلد (علاقے کے علماء میں سب سے زیادہ عالم) ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔

(ii)مفتی کی اعلمیت

مفتی کے اعلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکم شرعی میں باقی علماء سے زیادہ مہارت اور صلاحیت رکھتا ہو۔

(iii)حاکم کی اعلمیت

حاکم کے اعلم ہونے کا مطلب صرف استنباط احکام میں ذہین ہونا نہیں بلکہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی امور کو سمجھنے میں ذہین ہونا بھی شرط ہے یعنی اس کے لئے احکام میں بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، اقتصادی امور اور تدبیر امور مملکت میں مہارت اور ذہانت کا مالک ہونا بھی ضروری ہے۔

اس لئے اگر ایک فقیہ صرف بعض امور میں مہارت رکھتا ہے اور دوسرا فقیہ تمام امور میں ماہر ہے، گو کہ وہ پہلے فقیہ کے اختصاص مواضع میں اس کے برابر و ہم پلہ نہیں ہے اس کے باوجود ولایت وزعامت اسی کو ملے گی جو مجموعی حیثیت سے اسلام شناس ہو، اگر دونوں یا تینوں فقیہ ہم پلہ ہوں تو اس صورت میں کیا ہوگا؟ یہ ہم آئندہ صفحات میں بتائیں گے۔

اعلمیت شرط نہ ہونے کی ایک دلیل خود امام زمانہؑ کا یہ عمل ہے کہ آپؑ نے جناب حسین ابن روحؒ کو اپنا راز دار ہونے کی وجہ سے اپنا نائب بنایا۔ باوجود اس کے کہ ان سے اعلم اور زیادہ مہارت رکھنے والے بھی موجود تھے۔

"...اعترضوا علیٰ ابی سهل النوبختی ،فقیل له :کیف صار هذاالامر(ای السفارة)الیٰ الشیخ ابی القاسم الحسین ابن روح دونک ؟فقال :هم اعلم وما اختاروه .ولکن انا رجل القی الخصوم واناظرهم ،ولو علمت مکانه کما علم ابوالقاسم ،وصغطتنی الحجة لعلّی کنت ادل علیٰ مکانه

وابو القاسم فلو کان الحجة تحت ذیلہٖ وقرض بالقاریض ما کشف الذیل عنہ."

"جناب حسینؒ ابن روح کے امام زمانہؑ کے نائب بننے پر جناب ابوسہل نوبختیؒ سے سوال کیا گیا کہ آپ کی موجودگی میں وہ (حسینؒ ابن روح) کیسے نائب بن گئے؟ انہوں نے کہا کہ وہ خود خوب جانتے ہیں میں ایک مناظر شخص ہوں اگر میں ان کی طرح امام زمانہؑ کی رہائش گاہ سے آگاہ ہو جاؤں تو ممکن ہے کہ بوقت ضرورت اثبات حق کے لئے میں لوگوں کو ان کی رہائش گاہ سے آگاہ کر دوں، جبکہ اگر امام زمانہؑ ابوالقاسم حسین بن روح کے دامن کے نیچے ہوں اور ان (حسینؒ بن روح) کو قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو پھر بھی وہ ہرگز اپنے دامن کو نہیں اٹھائیں گے۔" (تاریخ الغیبۃ العصدی۔ ج ۱ص ۲۷۶ نقلاً عن غیبۃ الطّوسی۔ ص ۲۴۰، البحار ج ۱۳ ص ۹۸)

اس روایت کے علاوہ اس طرح کی اور بھی روایات ہیں۔ اختصار کی وجہ سے ان کا ذکر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیابت امامؑ کی شرائط میں علم وعدل کے علاوہ ایک اور چیز بھی ایسی ہے جو اہل نیابت قرار دیئے جانے میں ضرور دخیل ہے۔

اس دور میں نیابت جناب ابوسہل نوبختیؒ کے تفسیر واستنباط کی بناء پر، سرّیت اور ضبط اخبار و کتمانِ سر (راز پوشیدہ رکھنا) کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لہٰذا ابوسہل نوبختی کی بجائے جناب حسینؒ بن روح کو مذکورہ صفات کی وجہ سے نائب امام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی طرح کسی اور زمانہ میں کسی دوسری چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو نائب امام زمانہؑ میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

جس طرح ایک وقت میں مسئلہ قیادت باقی تمام مسائل پر فوقیت رکھتا ہے تو کبھی سیاست اور ملک کو چلانے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور کبھی اقتصادی پہلو کا رجحان زیادہ ہوتا ہے۔اس صورت میں یقیناً اس ضروری نقطہ کو فوقیت حاصل ہوگی۔

لہٰذا وہ فقیہ جسے صرف استنباط احکام فقہی (نماز، روزہ، حج وغیرہ) میں تو زیادہ مہارت حاصل ہو لیکن تطبیق احکام اور اس کو چلانے میں تدبیر و مدیریت کا اس میں فقدان ہو، اس کی نسبت وہ فقیہ جسے استنباط احکام فقہی میں تو نسبتاً کم مہارت حاصل ہو لیکن قیادت کی باقی صفات میں وہ زیادہ ماہر ہو تو یقیناً اس فقیہ کو ولایتِ فقیہ کے لئے چن لیا جائے گا، کیونکہ فقیہ جامع الشرائط نماز، روزے کے مسائل میں دوسرے فقہاء سے مدد اور مشورہ لے سکتا ہے جبکہ مدیریت اور تدبیر ہمیشہ مشورہ سے حاصل نہیں ہوتی۔

۲۔عدالت

خلافت و امامت کا ایک اہم وصف عدل و انصاف ہے، فقیہ جب ہوا وہوس اور خواہشات نفسانی کی پیروی کرے گا تو وہ لازماً اعتدال کی راہ اور صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا اور جب وہ خود ہدایت اور سعادت سے محروم ہوگا تو لامحالہ وہ دوسروں کو بھی محروم رکھے گا اور اس پر کوئی اعتماد نہیں کرے گا۔

انسانی و اسلامی معاشرے میں عدل و انصاف کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ یہ سارا نظام کائنات عدل و انصاف پر قائم ہے بطور نمونہ چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

"اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ o وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ يَسۡجُدَانِ o
وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الۡمِيۡزَانَ o اَلَّا تَطۡغَوۡا فِى الۡمِيۡزَانِ o
وَاَقِيۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِيۡزَانَ o"

"سورج اور چاند حساب پر چلتے ہیں اور (ہر) گیاہ اور درخت دونوں

سجدے میں ہیں اور آسمان کو اس نے بلند کیا اور (اس کی حفاظت ونگہداری کے لئے) میزان (قانون) مقرر کیا اور (یہ سب ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم سب) انصاف سے وزن کو (ٹھیک ٹھیک) جانچو! اور میزان کو نقصان نہ پہنچاؤ!۔" (الرحمن ۵ تا ۹)

"اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۚ وَلَئِنۡ زَالَتَا اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ۝"

"بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو اس بات سے روکے ہوئے ہیں کہ یہ (اپنی اپنی جگہ سے) ٹل نہ جائیں۔ اور اگر یہ (اپنی اپنی جگہ سے) ٹل جاتے تو اس کے بعد (اللہ کے بغیر) کوئی ایسا نہیں جو ان کو روک دیتا۔ یقیناً وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے۔" (فاطر ۔ ۴۱)

نظام کائنات عدل وقسط (انصاف) پر قائم ہے اسی طرح معاشرتی واجتماعی نظام بھی عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیئے، اسی قانون عدل وانصاف کی راہوں کو بتانے اور اس راہ پر انسان کو چلانے کے لئے انبیاء عظامؑ کو بھیجا گیا۔

قرآن کریم کا فرمان ہے:

"لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ"

"ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح وروشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔" (الحدید ۔ ۲۵)

اسی غرض کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس راہ پر چلنے کا حکم دیا ہے جو کہ ایک فطری راہ ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْأِحْسَانِ."

"بے شک اللہ عدل وانصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔" (نحل ۹)

دوسری جانب اگر عدالت شرط نہ ہوتو اس منصب پر ایسا شخص بھی آ سکتا ہے جو صفت عدل کی ضد یعنی ظلم سے متصف ہو، ظالم کی پیروی اور حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کی اطاعت کرنے سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو روک دیا ہے۔ یہ مطلب قرآن کے واضح ترین احکام اور بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم میں تضاد لازم آجائے گا۔ کیونکہ اگر ظالم کی اطاعت، اس کے حاکم ہونے کی وجہ سے واجب ہے تو دوسری طرف ہر ظالم کی پیروی کرنے یا اس پر اعتماد کرنے سے روک دیا گیا ہے اور اس کی اطاعت حرام قرار دی ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے:

"وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ."

"(اور مسلمانو!) جن لوگوں نے (ہماری نافرمانی کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا ہے ان کی طرف مائل نہ ہونا ورنہ تم تک بھی (دوزخ کی) آگ آ لپٹے گی اور خدا کے سوا اور لوگ تمہارے سرپرست بھی نہیں ہیں۔" (ھود ۱۱۳)

"وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا."

"اور جس کے دل کو ہم نے (گویا خود) اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش نفسانی کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا کام سراسر زیادتی ہے اس کا کہنا ہرگز نہ ماننا۔" (کھف ۲۸)

ظالم کسی بھی منصب الٰہی کا مستحق نہیں ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

"لَا يَنَالُ عَهْدِى الظَّالِمِيْنَ."

''میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔'' (بقرة. ۱۲۴)

اور ظالم کی اطاعت کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔جیسا کہ فرمان امیرالمومنینؑ ہے۔

''لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.''

''خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔'' (نہج البلاغہ حکمۃ ۱۶۵)

علاوہ ازایں ولایتِ فقیہ پر قائم کردہ ادلہ نقلیہ میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ فقیہ اور جامع الشرائط مجتہد سے مراد صرف علم کا مالک ہونا نہیں بلکہ عالم باعمل اور حتی الامکان اعلیٰ درجہ کی عدالت پر فائز ہونا ضروری ہے۔جیسا کہ ایک روایت میں یوں بتایا گیا ہے:

''عن ابی عبدالله الصّادق (ع)قال ،قال رسول الله (ص) الفقهآء امنآء الرّسل ما لم یدخلوا فی الدّنیا .قیل یا رسول الله(ص) ! وما دخولهم فی الدّنیا؟قال اتباع السّلطان،فأذا فعلوا ذٰلک فاحذروهم علیٰ دینکم.''

''امام صادقؑ سرورِ کائناتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا فقہاء جب تک دنیا (پرستی ،دنیاوی امور) میں داخل نہیں ہوتے ،وہ انبیاءِ الٰہیؑ کے امانت دار ہیں ۔پوچھا گیا، یارسول اللہؐ! (فقہاء کے) دنیاوی امور میں داخل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: سلطان (جابر حاکم) کی پیروی کرنا، جب وہ ایسا کریں تو ان سے (اپنے دین کی ضروریات حاصل کرنے سے) پرہیز کرو!''۔(اصول کافی ج ۱ / ص ۵۸)

اسلامی اصولوں کے مطابق مندرجہ ذیل افراد میں عدالت کا ہونا شرط ہے۔

۱۔مفتی

۲۔قاضی

۳۔امام جماعت

۴۔گواہ وغیرہ

جب ان افراد کے لئے عدالت کا ہونا ضروری ہے تو ولی فقیہ کے لئے بطریق اولیٰ شرط ہے، کیونکہ یہی صفت عدالت ہے جو صفت عصمت امامؑ کی جگہ لیتی ہے۔اس کے علاوہ مسئولیت اور ولی فقیہ کی ذمہ داری اتنی بڑی اور عظیم ہے کہ مسلمانوں کے تمام امور اس کے سپرد کردیئے گئے ہیں جو کہ اعتماد اور اطمینان کے بغیر ممکن نہیں۔

۳۔صلاحیت

فقیہ عادل کی ولایتِ عامہ کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ اس میں منصب اور عہدہ کے لئے صلاحیت اور اہلیت موجود ہو۔صلاحیت سے مراد علم وعدالت کے علاوہ وہ تمام صفات ہیں جو کسی حکومت عادلانہ کو چلانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

علم وعدالت بھی صلاحیت کے زمرے میں آتے ہیں لیکن ان کی اہمیت کی وجہ سے انہیں علیحدہ بیان کیا ہے، یہاں صلاحیت کے ضمن میں ان چیزوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

ا۔سیاسی بصیرت

سیاسی امور میں اگر کوئی بصیرت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے ملک کو چلانے سے عاجز ہے، حضرت امیرالمومنینؑ کا فرمان ہے:

"آفة الزّعامة ضعف السّياسة"

''زعامت کی آفت سیاست کی کمزوری ہے۔''(غرر الحکم. ۱۳۶)

۲۔زمانے کے حالات سے آگاہی

زمانے کے حالات سے آگاہ ہونے کی اہمیت واضح ہے،اگر واقعات سے آگاہی نہ ہوتو اسلامی مملکت یقیناً پیچھے رہ جائے گی اور یہ مملکت یقیناً غیر ترقی یافتہ سمجھی جائے گی۔اس کے علاوہ زمانے کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے دھوکہ کھانے کا بھی امکان ہے،خصوصاً موجودہ دور تو دھوکہ بازی اور فریب کاری کا دور ہے ہی۔امام صادقؑ کا فرمان ہے:

''العالم بزمانه لا تهجم عليه اللوابس.''

''اپنے زمانے کے حالات سے واقف علماء پر کبھی کوئی چیز مشتبہ نہیں ہوتی۔''(تحف العقول. ۲۶۱)

۳۔تدبیر

قوت تدبیر کی ضرورت بھی واضح ہے کیونکہ امت مسلمہ کی سرداری اور ان کے معاملات،انفرادی واجتماعی،دینی اور دنیاوی امور کو اسلام کے راستے پر چلانے کے لئے مدبرانہ قیادت کی ضرورت پوشیدہ نہیں ہے،لہٰذا فقیہ کے لئے سوچ اور تدبر و تدبیر کا مالک ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

چند افراد پر مشتمل ایک گھر کے سربراہ کے لئے اگر یہی قوت تدبیر ضروری ہے تو ایک مملکت کو چلانے والے کے لئے بطریق اولیٰ اس صفت سے متصف ہونا ضروری ہے۔[1]

۴۔قوتِ فیصلہ

یہ بھی ایک اہم شرط ہے کیونکہ بیک وقت بڑے بڑے فیصلے کرنے پڑتے ہیں،کبھی ایک واقعہ کے کئی پہلو سامنے آجاتے ہیں،چنانچہ چھوٹے سے لے کر بڑے فیصلہ تک قوت فیصلہ

[1] فرمانِ امام باقرؑ۔کافی۔ج ۲۔ص ۳۵۵ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کے کمزور ہونے سے سیاست کا رخ بدل جاتا ہے، حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔

"ایّھاالنّاس انّ احقّ النّاس بھٰذاالأمر اقواھم علیه واعلمھم بأمر اللّٰه فیه"

"اے لوگو! تم لوگوں میں اس خلافت کا اہل وہ ہے جو اس (کے نظم ونسق برقرار رکھنے) کی سب سے زیادہ قوت (وصلاحیت) رکھتا ہو، اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام سب سے زیادہ جانتا ہو۔" (نہج البلاغہ خطبہ۔۱۷۳)

۵۔شجاعت

اس کی اہمیت بھی پوشیدہ نہیں ہے۔اسلام کا نفاذ کرنے کے لئے شجاع ہونا ضروری ہے تاکہ بزدلی کی وجہ سے حکم خدا معطل ہو کر نہ رہ جائے۔

"لَاتَأخُذُهُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَآئِمٍ."

"یعنی اسے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی۔"

"وَزَادَهُ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ"

"اور (مال میں نہ سہی) مگر علم اور جسم کا پھیلاؤ تو اسی خدا نے زیادہ فرمایا ہے۔" (البقرة۔۲۴۷)

اس کے علاوہ قوی اور شجاع اسلام کے اصل راستے پر گامزن رہے گا اور اندرونی وبیرونی مختلف عناصر کے دباؤ میں آکر مشرق یا مغرب کی طرف مائل نہیں ہوگا، اور اپنے صحیح موقف پر پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے گا، جیسا کہ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

"کالجبل لا تزیله القواصف ولا تحرکه العواصف."

"وہ مضبوط پہاڑ کی مانند ہے کہ نہ بادِ تُند جسے ہلاسکتی ہے اور نہ تیز آندھی

اسے اکھاڑ سکتی ہے۔''

ان چند اوصاف کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جن کا صلاحیت کے ضمن میں فقیہ جامع الشرائط میں ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے جن کا ذکر اس بحث کے آخر میں کیا جائے گا۔

عموماً اسلامی مملکت کے سربراہ یعنی ولی فقیہ میں ان شرائط کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں، بلکہ یہ دنیا کے معمول کے مطابق ہے اگر کسی کارخانہ کو چلانے کے لئے کسی مدیر کی ضرورت پڑے تو یقیناً اس کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے گا جسے اس قسم کے کام میں فنی مہارت حاصل ہو۔ ایک بیمار شخص کی بیماری کی تشخیص کے لئے ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے کوئی بلڈنگ بنانی ہو تو انجینئر کو تلاش کیا جاتا ہے تو کیا یہ معقول بات ہے کہ اسلامی نظام کو چلانے کیلئے فرد میں کوئی مہارت اور شرط ضروری نہ ہو، اور جسے چاہے منتخب کر لیا جائے۔

مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لئے مثبت شرائط کے بعد چند منفی شرائط کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو کہ مذکورہ شرائط کے ضمن میں بھی آتی ہیں۔

منفی شرائطِ فقیہ

امام المتقینؑ فرماتے ہیں:

"ولقد علمتم انّہ لا ینبغی ان یکون الوالی علی الفروج والدّمآء والمغانم والأحکام وامامة المسلمین البخیل فتکون فی اموالھم نھمتہ، ولا الجاھل فیضلھم بجھلہ، ولا الجافی فیقطعھم بجفآئہ، ولا الحآئف للدول فیتّخذ قوماً دون قوم، ولا المرتشی فی الحکم فیذھب بالحقوق ویقف بھا دون المقاطع، ولا المعطل بالسّنة فیھلک الأمّة"

"(اے لوگو!) تمہیں یہ معلوم ہے کہ ناموس، خون، مال غنیمت (نفاذ) احکام اور مسلمانوں کی پیشوائی کے لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ کوئی بخیل حاکم ہو کیونکہ اس کا دانت مسلمانوں کے مال پر لگا رہے گا اور نہ کوئی جاہل، کہ وہ انہیں اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کرے گا اور نہ کوئی کج خلق کہ وہ اپنی تند مزاجی سے چرکے لگاتا رہے گا اور نہ کوئی مال و دولت میں بے راہ روی کرنے والا کہ وہ کچھ لوگوں کو دے گا اور کچھ کو محروم کر دے گا اور نہ فیصلہ کرنے میں رشوت لینے والا کہ وہ دوسروں کے حقوق کو رائیگاں کر دے گا اور انہیں انجام تک نہ پہنچائے گا اور نہ کوئی سنت کو بے

کارکردینے والا کہ وہ امت کوتباہ وبرباد کردے گا۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۱)

ا۔بخیل

اسے بخیل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ بخیل وکنجوس ہونے کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں

(i) دوسروں کے اموال کو اپنی جائیداد میں شامل کرنا چاہے گا، تا کہ اس کا مال زیادہ سے زیادہ ہوجائے۔

(ii) اپنا مال خرچ نہ کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری دولت کو ضروری منصوبوں اور دیگر کاموں پر صرف کرنے سے ہچکچائے گا۔

یہ دونوں نتیجے اسلام کے معیار حاکمیت کے خلاف ہیں۔

۲۔جاہل

اسے جاہل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اسلامی قانون اور زمانے کے دیگر حالات سے جاہل ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کی گمراہی کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کو اسلامی معاشرے میں نافذ نہیں کر سکے گا۔

"فاقد الشیء لا یعطیه."

"یعنی جو شخص کسی چیز کا مالک نہ ہو دوسروں کو کیا دے گا؟

رسول اکرمؐ نااہل کو مسلمانوں کی قیادت دینے کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"من تقدّم علی المسلمین وهو یریٰ انّ فیه من هو افضل منه فقد خان الله ورسوله والمسلمین."

"جو شخص مسلمانوں کا قائد بنے جب کہ اس سے افضل ان میں موجود ہوں، اس نے اللہ اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت

کی۔"(الحیاۃ ج ۲ / ص ۳۶۲)

جناب نبی کریمؐ کا فرمان ہے:

"من ام قوماً وفیهم من هو اعلم منه وافقه،لم یزل امرهم الیٰ سفال یوم القیامة."

"جو شخص کسی قوم کا امام بنے اور ان میں اس سے اعلم اور افقہ افراد موجود ہوں تو قیامت تک ان کے امور ترقی و بلندی سے ہمکنار نہیں ہوں گے۔"(الحیاۃ ج ۲ /ص ۳۶۲)

۳۔ظالم

اسے ظالم نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ ظلم کے ذریعے مسلمانوں اوران کی وحدت اور اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور مسلمانوں کی حکومت کو ختم کر دے گا، جیسا کہ ارشاد امیر المومنینؑ ہے:

"الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم."

"ملک وسلطنت کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ نہیں۔"

۴۔خائن

اسے مالی امور میں خائن نہیں ہونا چاہیے ، کیونکہ مالی معاملات میں جب وہ انصاف سے کام نہ لے گا تو تقسیم اموال میں ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح دے کر طبقاتی اختلاف کو ہوا دے گا جو کہ اسلام میں جائز نہیں ہے۔

۵۔رشوت خور

اسے رشوت خور نہیں ہونا چاہئے کیونکہ حاکم کی رشوت خوری سے ظلم کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور حق دار اپنے شرعی اور قانونی حق سے محروم رہ جاتا ہے جس سے حدود وقوانین الٰہی کا نفاذ نہیں ہوسکتا۔

۶ سنت خدا کو ترک کرنے والا

اسے سنت خدا کو ترک کرنے والا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ سنت خدا اور رسول کو ترک کرنے کی صورت میں حکم الٰہی کا اجراء معطل ہو جاتا ہے اور اسی طرح وہ امت مسلمہ کی ہلاکت کا بھی سبب بنتا ہے۔

۷۔ دنیا پرست

اسے دنیا پرست نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دنیا پرستی، جاہ طلبی اور شہرت خواہی کا جذبہ رکھنے والے کے لئے رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

"اذا رایتم العالم محبّا لدنیاہ فاتّھموہ علیٰ دینکم."

"جب کسی عالم کو دنیا پرست پاؤ تو اس کو اپنے دین (کے معاملات) میں متہم کرو! (اس کی دیانت درست نہ تھی نہ ہے)۔" (الحیاۃ ج ۲/ص ۳۶۳)

"اوحی اللّٰہ الی داؤد ،لاتجعل بینی وبینک عالما مفتونا بالدنیا فیصدک عن طریق محبتی فأنّ اولئک قطّاع طریق عبادی المریدین "(کافی ا/۴۶۔الحیاۃ ج ۲/۳۶۳)

"حضرت داؤدؑ پر وحی ہوئی (اے داؤد!) میرے اور اپنے درمیان ایسے عالم کو قرار نہ دینا جو عاشق دنیا ہو، کیونکہ وہ میرے چاہنے والے بندگان کے راہزن ہیں اور میرے بندوں کو مجھ سے دور کرتا ہے۔"

۸۔ سطح زندگی بلند

حاکم اسلامی کی زندگی عام لوگوں کی زندگی سے بلند نہیں ہونی چاہیے یہ فرق مأکل ومسکن (کھانے پینے اور رہنے) دونوں اعتبار سے ہے۔

لیکن اگر مکان کے اعتبار سے امن وسلامتی کا خطرہ موجود ہو تو ضرورت کے مطابق استفادہ کرنا ناجائز نہیں ہے۔

مولائے متقیانؑ کے فرامین کا مطالعہ کرنے سے اس قسم کی شرائط بخوبی واضح ہو جاتی ہیں اور معلوم ہو جاتا ہے کہ والی (حاکم) کو اپنی رعیت کی ہمدردی اور اس کی قلبی تسکین کے لئے کس حد تک اور کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ آپؑ والی کو اس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ وہ کسی کی ایسی دعوت ولیمہ میں جا کر لذیذ کھانے کھائے جس میں غریبوں اور فقیروں کو آنے کی اجازت نہ ہو۔ آپؑ کے والی بصرہ عثمان بن حنیف کا واقعہ مشہور ہے۔

اس کو پڑھنے کے خواہشمند حضرات کتاب نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۴۵ کی طرف رجوع فرمائیں۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"انّ اللّٰہ جعلنی اماماً لخلقہ ،ففرض علی التقدیر فی نفسی مطعمی ومشربی وملبسی کضعفآء النّاس ،کی یقتدی الفقیر بفقری ولا یطغیٰ الغنی غناہ."

"بے شک اللہ نے مجھے اپنے بندوں پر امام اور رہبر بنایا اور مجھ پر یہ فرض کیا کہ میں کھانے پینے اور لباس میں فقیر اور غریب کی طرح زندگی بسر کروں تا کہ فقیر وغریب کے لئے میرا عمل نمونہ ہو اور امیر کے لئے اس کی دولت،غنی کے لئے اس کی غناء وتونگری طغیان وسرکشی کا سبب نہ بن جائے۔" (الحیاۃ ج ۲/ص ۳۸۹، ۳۹۰)

"المعلی ابن خنیس قال فقلت لو کان ھٰذا (الحکم) الیکم لعشنا .فقال ھیھات یا معلی! اما واللّٰہ ان لو کان ذاک ما کان الّا سیاسۃ اللّیل وسیاحۃ النّھار ولبس

الخشن واکل الخشب "

"معلّٰی ابن خنیس نے امام صادقؑ سے ایک دن حکمرانوں [1] کے ناز و نعم کا ذکر کرتے ہوئے کہا: فرزند رسولؐ! اگر حکومت کے اختیارات آپؑ کے پاس ہوتے تو پھر ہم بھی آپؑ کے زیر سایہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے۔امام صادقؑ نے فرمایا: اے معلّٰی! یہ دور از حقیقت بات ہے، اللہ کی قسم! اگر حکومت کی زمام ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو رات کو امور رعیت کی تدبیر، دن کو بندوں کی فلاح و بہبود کی خاطر گھومنے، کھردرے کپڑے پہننے اور ناگوار کھانوں کے سوا کچھ نہ ملتا۔" (الحیاۃ۔۲/۳۹۰)

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"انّ اللّٰہ تعالیٰ،فرض علیٰ ائمة الحق ان یقدروا انفسھم بضعفة النّاس ، کیلا ینبیغ بالفقیر فقرہ "

"تحقیق ،اللہ تعالیٰ نے امام حق پر فرض ولازم قرار دیا ہے کہ اپنے نفس کو کمزور لوگوں کی طرح قرار دے تاکہ فقیر پر اس کی تنگدستی حملہ آور نہ ہو جائے اور اس کو راہ حق سے خارج نہ کردے۔" (الحیاۃ۔ج۲/ص۲۵۹)

مسلمانوں کے رہبر کے متعلق امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"لایقیم امر اللّٰہ سبحانہ الّا من لا یصانع ولا یضارع ولا یتبع المطامع."

"حکم خدا کا نفاذ وہی کرسکتا ہے جو (حق کے معاملے میں) نرمی نہ برتے، عجز و کمزوری کا اظہار نہ کرے اور حرص و طمع کے پیچھے نہ لگ جائے۔" (نہج البلاغہ، صبحی صالحی الکلمۃ۔۱۱۵)

---

[1] اس کا اشارہ بنی امیہ یا ایسے خاندانوں کی طرف ہے جو حکومت کے زیر سایہ ہوتے تھے۔

۹۔ مصانعہ

''مصانعہ'' سے مراد ہر وہ حرکت اور عمل وسلوک ہے جو کسی اسلامی اصول وقانون کے مطابق نہ ہو، بلکہ اس میں انسان کی اپنی ذات کا دخل ہو۔

اس کی تفصیل یوں ہے:۔

کوئی بھی انسان جب کوئی کام یا عمل انجام دیتا ہے تو اس کے دو لحاظ اور محرکوں میں سے ایک ہوسکتا ہے،

ا۔ پہلا محرک یہ ہے کہ انسان جب کسی منصب ومقام پر فائز ہوتا ہے، ہمارے موضوع کے مطابق اسلامی قانون نافذ کرنے کے درپے ہوتا ہے تو اس کے ارد گرد، ذاتی تعلقات، دوستوں کی دوستی کے تقاضے، کنبہ پروری اور مصلحتوں (البتہ یہ مصلحت اسلام کی خاطر نہ ہو) کا ہجوم ہوتا ہے اور ہر طرف سے اس کے مقام سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں کے لامتناہی سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے، جس سے انسان کبھی ماحول، معاشرتی حالات اور حاکم کے زیر اثر آ کر کوئی کام کر جاتا ہے اور یہ کام اصول عدل ومساوات اور روح قانون اسلام کے بالکل خلاف بھی ہوسکتا ہے، اس فعل کا نام مصانعہ کاری، سودے بازی اور اقرباء پروری وغیرہ کی پرستش ہے، جو ایک مذموم فعل اور اسلام کے اصول عدل ومساوات کے مطابق جرم شمار ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا محرک، جو انسان کے کسی کام کو انجام دینے کا باعث بنتا ہے وہ پہلے محرک کے برعکس اسلامی اصول عدل وبنیادی مساوات اور صحیح معیار ومیزان کے مطابق ہوتا ہے، اگر کسی کے سپرد کوئی منصب کیا جاتا ہے تو اس کا عامل اور حقیقی محرک اس شخص میں پائی جانے والی صفات وامتیازات اور ذاتی صلاحیت بن جاتی ہے۔ اگر کسی کو وہ مقام وعہدہ دینے سے گریز کرتا ہے تو اس کی عدم صلاحیت اور اس کام کے مستحق نہ ہونے کی بناء پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی کو کوئی مقام وعہدہ دینے کے بعد اسے اس کے مقام سے معزول کرنا اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ وہ مقام

اوراس کے تقاضے اس شخص کی صلاحیتوں سے بالا اور بالاتر ہیں۔

اس بناء پر حاکم اسلامی اور ولی فقیہ کے لئے پہلی قسم کے اعمال، افعال اور سلوک سے مبرّا اور پاک ہونا ضروری ہے۔[1]

حضرت علیؑ نے اس لفظ ''مصانعہ'' کے معنی اور جگہ بیان فرمائے ہیں، آپؑ فرماتے ہیں:

''فلا تکلّمونی بما تکلّم به الجبابرة ..... ولا تخالطونی بالمصانعة.''

''مجھ سے ویسی باتیں باتیں نہ کیا کرو! جیسی جابر وسرکش فرمانرواؤں سے کی جاتی ہیں۔۔۔۔اور مجھ سے اس طرح کا میل جول نہ رکھو! جس سے چاپلوسی اور خوشامد کا پہلو نکلتا ہو۔'' (نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۴)

علماء کے نزدیک عام حکمرانوں اور بادشاہوں کی مداحی، ثناخوانی اور چاپلوسی کرنا ''مصانعہ'' ہے، اس قسم کی گفتگو، روش اور سلوک سے حق تلفی، اغراء بجہل (جہالت کی طرف لے جانا)، گمراہ کرنے اور ہونے کے علاوہ کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا، کیونکہ یہ طریقہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے دوسری جانب ایسا کرنا، دوسروں کی غیر شرعی خواہشات کی تکمیل، نفسیاتی کمزوری، کمزور ارادہ اور شجاعت، جرات ومردانگی کے فقدان کی علامت ہے، جوکہ ایک رہبر وقائد اسلامی کے لئے سزاوار نہیں۔ تیسری جانب یہ کام رہبری کے منصب ومقام اور قیادت امت سے خیانت اور غداری کی بھی غمازی کرتا ہے۔

۱۰۔ مضارعة

اس کا مطلب اپنے آپ کو کسی دوسرے کے مشابہ بنانا ہے۔ دوسرے کی فکر، عمل اور اخلاق وغیرہ سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ یہ ایک مذموم صفت ہے اور قائد اسلام کو اس

---

[1] حضرت علیؑ کے دورِ حکومت میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

سے مبرا ہونا چاہئے کیونکہ عموما کوئی بھی کسی معاشرتی عیب، اخلاقی کمزوری، صحیح فکر کے فقدان، انحراف اور کج روی سے خالی نہیں ہوتا اور قائد کو چاہئے کہ معاشرے میں موجود تمام کمزوریوں کی تشخیص کر کے علاج اور حل پیش کرے اور جب کوئی اسلامی امت کا رہبر یا کوئی بھی قائد معاشرے میں رائج رسم ورواج، اخلاقی آداب، تہذیب وتمدن اور فکری کمزوریوں میں شریک ہو کر ان کے رنگ میں رنگ جائے گا تو وہ اپنے معاشرے کی اصلاح نہیں کر سکتا، کیونکہ مریض معاشرے کی پیروی کرنے سے وہ قائد بھی اخلاقی، فکری اور عملی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے گا جس کا نتیجہ اصلاح معاشرہ کے برعکس نکلے گا۔

کسی بھی قائد کو سب سے پہلے اپنی اصلاح، خود سازی اور تعمیر ذات کو اولیت دینا چاہئے، جس کی ذات، بذات خود درست نہ ہو وہ دوسروں کو کیسے درست کر سکتا ہے؟ حضرت امیر المومنینؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"من نصب نفسه للنّاس امامافليبدا بتعليم نفسه قبل تعليم غيره وليكن تأديبه بسيرته قبل تأديبه بلسانه ومعلم نفسه ومؤدّبها احق بالأجلال من معلم النّاس ومؤدّبهم."

"جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کی رہبری کے لئے پیش کرتا ہے اسے چاہئے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے آپ کو تعلیم سے آراستہ کرے اور زبان سے تبلیغ کرنے سے پہلے اپنے عمل سے تبلیغ کرے اور یہ یاد رکھے کہ اپنے نفس کو تعلیم وتربیت دینے والا دوسروں کو تعلیم وتربیت دینے والے سے زیادہ قابل احترام ہوتا ہے۔" (نہج البلاغہ کلمات۔۷۳)

خود اخلاقی اور نفسیاتی امراض میں مبتلا اور دوسروں کی اصلاح اور ان کی بیماریوں کا صحیح علاج پیش کرنے والے قائد پر یہ مثال صادق آتی ہے:

"وغير تقيّ يأمر النّاس بالتّقيّ كطبيب يداوى النّاس وهو

علیل "

''جو غیر متقی (شخص) لوگوں کو تقویٰ اور پرہیز گاری کی دعوت دیتا ہے، وہ اس ڈاکٹر کی مانند ہے جو لوگوں کا علاج معالجہ کرتا ہے لیکن خود بیمار رہتا ہے۔''

۱۱۔ طمع

طمع اور لالچ ایک قسم کی نفسیاتی اور اخلاقی اسارت (زنجیر) ہے قائد جب تک اس قید وبند سے آزاد نہ ہو وہ دوسروں کو اس سے رہائی نہیں دلا سکتا۔ حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

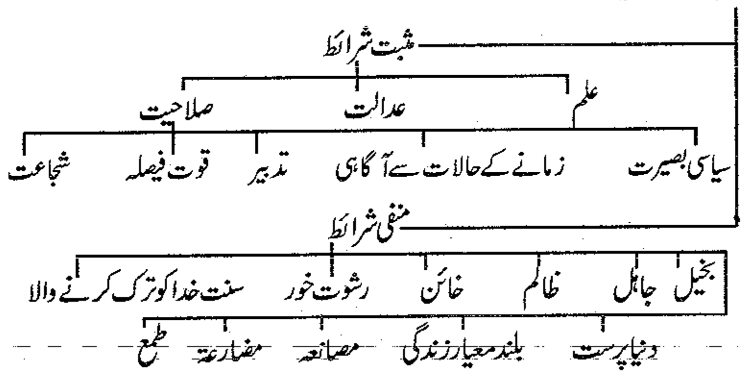
''الطَّمع رِقٌّ مؤبَّد '' ''طمع ولالچ دائمی قید و بند ہے۔''

اس اسارت اور دائمی قید و بند سے رہائی حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ جب تک طمع کا قلع قمع نہ کیا جائے تب یہ قید باقی رہتی ہے، امت اسلامیہ کے قائد و رہبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود اس قید سے آزاد ہو، تا کہ وہ دوسروں کو اس سے آزاد کرا سکے۔ مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ ولی فقیہ کے لئے دو طرح کی شرائط ہیں:

۱۔ مثبت۔ ۲۔ منفی۔

اس کو آسانی سے سمجھنے کے لئے یہ نقشہ ملاحظہ فرمائیں۔

حاکم اسلامی (فقیہ)



بناء برایں ولی فقیہ کو ان تمام شرائط سے متصف ہونا چاہئے تا کہ اسے مسلمانوں کے تمام امور میں دخل دینے اور ان کو چلانے کے لئے پورا پورا اعتماد حاصل ہو سکے۔

اگر ایک مجتہد (جامع الشرائط) ان صفات کا حامل ہوگا تو ولایت اور زعامت مسلمین اسی کو حاصل ہوگی اور امت اسلامیہ پر (مذہب تشیع کے مطابق) اس کی اطاعت کرنا واجب لازم ہے۔

اور اس فقیہ کی مخالفت، رسول اللہؐ اور ائمہ معصومینؑ کی مخالفت تصور کی جائے گی، جیسا کہ اس مطلب کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے:

"الرّآدّ علیهم کالرّآدّ علینا والرّآدّ فی حدّ الشّرک باللّٰه."

"فقہائے جامع الشرائط کا حکم مسترد کرنا ہمارا حکم مسترد کرنے کے مترادف ہے اور ہمارا حکم مسترد کرنے والا شرک باللہ کی حد پر تصور کیا جائے گا۔"

اگر امت اسلامیہ میں ایک سے زائد فقہاء بیک وقت موجود ہوں تو اس وقت کیا صورت ہوگی؟ اس کا تجزیہ ہم اگلے باب میں پیش کرتے ہیں۔

انتخابِ فقیہ

فقیہ جامع الشرائط کی تعداد ایک سے زیادہ ہونے کی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان میں سے ہر ایک کو ولایتِ عامہ اور اختیارات تامہ حاصل ہیں یا ان میں سے صرف ایک کو؟ اور اگر صرف ایک فقیہ حاکم مطلق ہو تو باقی فقہاء کے لئے کیا حکم ہے؟

جواب یہ ہے کہ قائد کا ایک ہونا ضروری ہے۔ اس صورت میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ متعدد فقہاء میں سے ایک کا انتخاب کس طرح عمل میں آئے گا؟ اور باقی فقہاء کی نسبت اس کی ولایت کہاں تک درست ہوگی؟

قیادتِ واحدۃ

قیادتِ واحدۃ اور اس کی دلیل کئی طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔

ا۔ سیرت اور سنتِ خدا

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے اس سرزمین پر جتنے بھی انبیاءؑ بھیجے ہیں ان کی چند قسمیں ہیں:

(i) جیسا کہ ہر دور میں ایک نبی و رسول ہوا کرتا تھا۔

(ii) ایک وقت میں ایک سے زائد نبی و رسول موجود ہوتے تھے لیکن ان میں سے ہر ایک کا محل امر اور دائرہ کار جدا ہوتا تھا۔

(iii) ایک وقت میں ایک محل و مقام کے لئے دو نبی و رسول بھی ہوا کرتے تھے لیکن

قیادت ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ہوتی تھی، جیسا کہ جناب موسیٰؑ اور ہارونؑ تھے۔

تاریخ انبیاء میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ایک محل کار پر دو نبی ورسول موجود ہوں اور ہر ایک کے اختیارات الگ الگ ہوں۔

اسی طرح ائمہ معصومینؑ کا دور بھی اس مطلب پر شاہد ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک امام ہوتا تھا باوجود اس کے کہ دونوں شخصیتیں بیک وقت امام بننے کی تمام قابلیتوں اور صلاحیتوں کی حامل ہوتی تھیں، جیسا کہ امیر المومنینؑ کے وقت حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ موجود تھے مگر امام کے تابع تھے، اسی طرح امام حسنؑ کے دور امامت میں حضرت امام حسینؑ موجود تھے لیکن خود امام نہیں تھے بلکہ اس وقت آپؑ امام حسنؑ کے فرمان پر عمل کرتے تھے۔

لہٰذا اس سیرت انبیاءؑ وائمہؑ اور سنت خدا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر دور اور ہر وقت کے لئے امام ایک ہی ہوتا ہے دو نہیں، خواہ اس وقت دوسرے ایسے افراد بھی موجود ہوں جن میں مستقل امام بننے کی قابلیت وصلاحیت موجود ہو۔

اس بناء پر دور غیبت کبریٰ میں بھی زمانہ انبیاءؑ وائمہؑ کی طرح ایسا فقیہ ایک ہی ہونا چاہیے جو مسلمانوں کے سیاہ وسفید پر اختیار رکھتا ہو، اس کی مزید وضاحت خود امام زمانہؑ کی سنت وسیرت میں موجود ہے۔ آپؑ اپنے غیبت صغریٰ کے دور میں اپنا نمائندہ ایک شخص ہی مقرر فرمایا کرتے تھے، جیسا کہ نواب اربعہ[1] آپؑ کی طرف سے یکے بعد دیگرے معین کئے گئے۔ امام زمانہؑ اگر چاہتے تو بیک وقت اپنے دو نمائندے مقرر فرما سکتے تھے لیکن آپؑ سنت الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے اور مسلمانوں کی وحدت کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنا نمائندہ ایک ہی مقرر فرماتے رہے حتیٰ کہ اگر آپؑ چاہتے تو دو محل کار میں اپنے دو نمائندے مقرر فرما سکتے تھے جیسا کہ نواب اربعہ کا محل کار بغداد تھا اور آپؑ کے شیعہ خراسان وغیرہ میں بھی موجود تھے اس طرح آپؑ اپنا ایک نمائندہ بغداد

---

[1] امام زمانہؑ نے اپنے دورِ غیبتِ صغریٰ میں یکے بعد دیگرے اپنے چار نائب مقرر فرمائے تھے۔ انہیں نوابِ اربعہ کہا جاتا ہے۔

اوراس کے نواح میں اورایک نمائندہ خراسان وغیرہ میں مقرر کر سکتے تھے۔

یہ تمام امورانجام نہ دینا اس امر کی دلیل ہے کہ نمائندہ امام زمانہؑ یا قائد ملت اسلامیہ ایک ہی ہوتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ امام زمانؑ کے نمائندے معروف نواب اربعہ کے علاوہ اور بھی موجود تھے، مگران سب کا رابطہ امام زمانؑ کے ساتھ نواب اربعہ کے ذریعے ہی ہوتا تھا، یعنی ان کی مستقل حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ وکیل در وکیل کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ سفراء امام زمانہؑ (نواب اربعہ) اور باقی وکلاء کے درمیان موجود فرق کا ذکر فرماتے ہوئے جناب علامہ السید محمد الصدرؒ اپنی کتاب ''تاریخ الغیبت الصغریٰ'' ج ۱ رص ۹۰۶ پر فرماتے ہیں:

''اولهما ان السفير لواحيه الامام المهدى(ع)مباشرة ويعرفه شخصيا ويأخذ منه التوقيعات والبينات على حسين ان الوكلاء ليسوا كذلك بل يكون اتصالهم بالمهدى(ع)عن طريق سفرآئه ليكون همزةالوصل بينهم وبين قواعدهم الشعبية ''

''سفیراوروکیل امام زمانہؑ میں پہلا فرق یہ ہے کہ سفیر (نواب اربعہ) براہ راست امام زمانہؑ کی خدمت میں شرف یاب ہوتے تھے اوران کو ذاتاً پہچانتے تھے اور ان سے بیان اور توقیعات حاصل کرتے تھے، لیکن (باقی) وکلاء اس طرح نہیں تھے بلکہ امام زمانہؑ سے ان (وکلاء) کا رابطہ سفراء (نواب اربعہ) کے ذریعے ہوتا تھا تاکہ یہ وکلاء نواب اربعہ اورعوام الناس کے درمیان رابطہ اوروصل کا کام انجام دیں۔''

چند ایسے وکلاء کے نام جو نواب اربعہ کے دور میں مذکورہ حیثیت سے کام کرتے

تھے، درج ذیل ہیں:

۱۔ حاجز (بغداد)

۲۔ بلالی (بغداد)

۳۔ عطار (بغداد)

۴۔ عاصمی (کوفہ)

۵۔ محمد بن ابراہیم بن مہز یار (اہواز)

۶۔ احمد بن قاسم (قم)

۷۔ محمد بن صالح (ہمدان)

۸۔ شامی (رے)

۹۔ قاسم بن علا (آذربائیجان)

۱۰۔ محمد بن شاذان نعیمی (نیشاپور)

۲۔ اختلاف رائے و عمل

قیادت متعدد ہونے کی صورت میں افراتفری پھیلتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے لامحالہ ایک دوسرے سے اختلاف رائے اور اختلاف عمل پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی ذمہ داری میں جتنا اضافہ ہوگا اتنا اختلاف رائے کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔

فقہائے عظام میں سے ہر ایک میں جو کہ انسانوں میں سے ہی ہیں، اختلاف کا مادہ موجود ہے، لہٰذا اگر ہر فقیہ ملت اسلامیہ کا قائد اعلیٰ ہو اور ہر ایک کے لئے حکومت کرنے کا حق عملی طور پر ثابت ہو تو لامحالہ مقام رہبری میں اختلاف رائے کی بناء پر اختلاف اور دوعملی ضرور پیدا ہوگی، جس کے نتیجے میں امور مملکت اور نظام حکومت مفلوج ہو جانے کا امکان پیدا ہوگا جو اسلامی

حکومت کی تشکیل کی غرض وغایت اوراہداف کے منافی ہے۔

آخر میں ہم امام ہشتم علی ابن موسیٰ الرضاؑ کا ارشاد وہدایت نقل کرتے ہیں جس کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہ جاتی، البتہ امامؑ کا یہ بیان امام (معصومؑ) کے متعلق ہے، لیکن مناط اور میزان ومعیار دونوں (حکومت معصومؑ اور حکومت فقیہ) کے درمیان ایک ہونے کی وجہ سے دونوں معیار پر پورا اترتا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"فأن قيل :فلم لا يجوز ان يكون في الأرض امامان في وقت واحد او اكثر من ذٰلک ؟قيل :لعلل،منها :ان الواحد لايختلف فعله وتدبيره،و الأثنين لا يتّفق فعلهما و تدبيرهما وذٰلک انّا لم نجد اثنين الّا مختلفى الهمم و الأرادة،فأذا كانا اثنين ثم اختلفت هممهماو ارادتهما و كانا كليهما مفترضي الطّاعة ،لم يكن احدهما اولىٰ بالطّاعة من صاحبه،فكان يكون فى ذٰلک اختلاف الخلق و التشاجر والفساد ثم لا يكون احد مطيعا لأحدهما الّا وهو،عاص للآخر فتعم المعصية اهل الأرض،ثم لا يكون لهم مع ذٰلک السبيل الى الطّاعة والأيمان ، و يكونون انّما اوتوا فى ذٰلک من قبل الصّانع والذى وضع لهم باب الأختلاف وسبب التشاجر ،اذا امرهم بأتّباع المختلفين "

"ومنها: انه لو كانا امامين ،لكان لكل من الخصمين ان يدعوا الى غير الذى يدعوا اليه الآخر فى حكومة،ثم لا يكون احدهما اولىٰ بأن يتّبع صاحبه من الآخر فتبطل الحقوق و الأحكام والحدود "

"ومنها :انــه لا یکون واحد من الحجّتین اولیٰ بالنّظر والحکم والأمر والنّهی من الآخر. فأذا کان هٰذا کذٰلک ،وجب علیهم ان یبتدءُ واالکلام ولیس لأحدهما ان یسبق صاحبه بشیء ،اذا کانا فی الأمامة شرعا واحداً،فأن حاز لأحدهما السّکوت ،حاز للآخر مثل ذٰلک .واذاحاز لهما السّکوت بطلت الحقوق والأحکام، وعطّلت الحدود،وصار النّاس کأنّهم لا امام لهم "

"اگرکوئی یہ کہے کہ ایک زمین میں دوامام کیوں نہیں ہوسکتے ؟ تو جواب میں کہا جائے گا کہ اس کی کئی وجوہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ ایک امام کے کردار وتدبیر میں کوئی اختلاف نہ ہوگا جبکہ دو کے کردار وتدبیر میں اتفاق ہونا مشکل ہے، کیونکہ ہم نے ہر دو کے عزم وارادے میں ہمیشہ اختلاف ہی دیکھا ہے، پس اگر دوامام ہوں اور دونوں کے عزم وارادے میں اختلاف پایا جائے اور دونوں کی اطاعت واجب ہوتو دونوں میں سے کسی ایک کی اطاعت کوترجیح حاصل نہیں ہوگی۔اس سے لوگوں میں اختلاف، جھگڑا اور فساد پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے، اور جب ایک کی اطاعت کی جائے تو دوسرے کی معصیت اورنافرمانی کی جائے گی اس طرح نافرمانی عام ہوجائے گی چنانچہ اطاعت وایمان کا راستہ بھی تنگ ہوجائے گا اور اس پرطرفہ یہ کہ اس کا سبب خود خداوند عالم بن رہا ہے، چونکہ اس نے دومتضاد افراد کی اطاعت کوواجب بنا کر اختلاف کا سبب پیدا کیا ہے۔"

"دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر امام دو ہوتے تو نزاعات میں طرفین ایک ایک امام کی طرف رجوع کرتے، ان میں سے کسی ایک امام کی طرف رجوع

کرنے کو ترجیح بھی نہ ہوگی، اس طرح حقوق، احکام اور حدود معطل ہو کر رہ جائیں گے۔"

"تیسری بات یہ ہے کہ احکام صادر کرنے، امر و نہی کرنے اور نگرانی رکھنے میں دونوں اماموں میں سے کسی ایک کو ترجیح نہ ہوگی، لہٰذا خود لوگوں کو پہل کرنا چاہئے کہ (وہ معصوم سے) سوال کریں، جواب دینے میں ایک امام کو دوسرے امام سے سبقت لینا بھی ضروری نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خاموشی اختیار کر سکتا ہے اور جب ایک امام کے لئے خاموشی اختیار کرنا جائز ہے تو دوسرے کے لئے بھی خاموشی جائز ہے، جب دونوں کے لئے خاموشی اختیار کرنا جائز ہوا تو حقوق، احکام اور حدود معطل ہو گئے اور لوگ گویا امام کے بغیر رہ گئے۔" (علل الشرائع. ص ۲۵۴، الحیاۃ. ج ۲/ص ۳۶۵)

قیادت واحدۃ کبھی واحد حقیقی ہوتی ہے اور کبھی واحد حکمی۔

واحدِ حقیقی

واحد حقیقی سے مراد وہ صورت ہے جس میں مسلمانوں کا قائد ایک ہی ہوتا ہے اور جسے تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

واحدِ حکمی

اس صورت میں فقہائے کرام کی تعداد ایک سے زیادہ ہوتی ہے اور اس صورت میں وہ باہمی مشورے سے ایک مجلس تشکیل دے کر باہمی صلاح و مشورے سے حکومت چلا سکتے ہیں، یعنی اس مجلس کے سامنے کئی صورتیں موجود ہیں جن میں سے کسی ایک پر وہ عمل پیرا ہو سکتے ہیں، یاد رہے کہ مجلس کے ارکان صرف مجتہد جامع الشرائط ہی ہو سکتے ہیں۔

مجلس کا دائرہ کار و اختیارات

ا۔ مجلس باہمی صلاح و مشورے سے اپنے اراکین میں سے ایک فقیہ کو عبوری یا دائمی طور پر منتخب کرے گی اور باقی فقہاء ان کے دستورات اور احکام کے پابند ہوں گے، دیگر مجتہدین کی مسئولیت حکومت کے امورات میں مشورہ دینا اور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی کرنے یا نہ کرنے پر کڑی نظر رکھنا ہوگی۔ بالفرض فقیہ حاکم میں صلاحیت اور شرائط رہبری ختم ہونے کی صورت میں باقی فقہاء کو اسے معزول کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک فقیہ کو منتخب کرنے کی بجائے سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور ثقافتی وغیرہ تمام حکومتی مسائل کو باہمی مشورہ سے حل کیا جائے گا اور مجلس کے اجلاس میں پیش شدہ مسئلہ کا بغور مطالعہ کر کے ایک مشترکہ بیان کے ذریعے طے شدہ مسئلہ نشر کیا جائے گا، اندرونی اختلاف موجود ہونے کی صورت میں اسے مجلس کے داخلی نظام کے ذریعے حل کیا جائے گا، مثلاً

(i) اکثریت کی رائے قابل اتباع ہوگی جو رائے شماری کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہے۔

(ii) ان فقہاء میں سے ایک فقیہ کو امتیازی یعنی صلاحیت کی بناء پر فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہوگا اور اس کی رائے کو حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہوگی۔

(iii) ہر ایک فقیہ کی صلاحیت مختلف ہونے کی صورت میں ہر فقیہ کی رائے اس کے اپنے دائرہ تشخص و مہارت سے متعلق موضوع کے اعتبار سے قابل عمل ہوگی۔ مثلاً ایک فقیہ کو اقتصادی میدان میں زیادہ مہارت حاصل ہے بہ نسبت سیاسی میدان کے، اور دوسرے فقیہ کو سیاسی میدان میں زیادہ مہارت حاصل ہے بہ نسبت انتظامی امور کے، تو ان کے درمیان اختلاف ہونے کی صورت میں اس مجتہد کی رائے کو اولیت حاصل ہوگی جو متعلقہ موضوع پر باقی فقہاء سے زیادہ مہارت اور صلاحیت رکھتا ہو۔

۳۔ ہر ایک فقیہ کو ولایتِ عامہ حاصل ہونے اور اس کے ساتھ نظم و ضبط برقرار رکھنے کی

ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک کا دائرہ کار جدا جدا معین کیا جائے، اور یہ انتخاب بھی باہمی مشورے سے عمل میں آئے تاکہ ہر ایک کے لئے اپنے اپنے دائرہ کار میں ولایتِ عامہ نافذ کرنے کا حق ثابت ہو سکے۔اس طرح اپنے دائرہ کار کے علاوہ کسی اور کی حدود میں دخل اندازی کرنے کا جواز باقی نہیں رہے گا۔

یہ طریقہ ایک وقت تھا جب علمائے شیعہ کے درمیان رائج ہوا تھا، یہ واقعہ مرجع شیعیان جہان، صاحب کرامات حضرت علامہ آیۃ اللہ العظمیٰ السید مہدی بحر العلومؒ کے دور میں رونما ہوا تھا، جب جناب موصوف کے دور میں ان کے علاوہ دیگر فقہاء نے جو الگ الگ صلاحیت وفعالیت کے مالک تھے، اتحاد اور وحدت کی مثال قائم کرتے ہوئے وظیفہ مرجعیت کو اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہوئے الگ الگ کام کا ذمہ قبول کیا۔

ان کے درمیان تقسیم کار اس طرح ہوئی تھی۔

(i) آیۃ اللہ العظمیٰ مہدی بحر العلومؒ:۔

(الف) زعامت وقیادت۔ (ب) تدریس علوم اسلامیہ۔

(ii) آیۃ اللہ العظمیٰ الزاہد الشیخ حسین نجفؒ:۔

(الف) اقامت نماز کا فریضہ، یاد رہے نجف اشرف میں اس وقت ایک نماز جماعت ہوتی تھی جس میں تمام علماء شریک ہوتے تھے۔

(iii) آیۃ اللہ العظمیٰ الشیخ جعفر کاشف الغطاءؒ:۔

آپؒ منصب فتویٰ پر فائز تھے، آپؒ کا کام اس حد تک اتحاد کا پیامبر ثابت ہوا کہ آیۃ اللہ العظمیٰ السید مہدی بحر العلومؒ کے اہل خاندان بھی آپؒ کے مقلدین میں شامل تھے۔

(iv) آیۃ اللہ العظمیٰ الشیخ شریف محی الدینؒ:۔

آپؒ منصب قضاء وعدالت کے فرائض انجام دیتے تھے۔(مقدمہ رجال بحر العلوم۔ج۱،ص۴۱)

مذکورہ تقسیم کار اس دور کے مطابق درست تھی لیکن اسلامی حکومت قائم کرنے کی صورت

میں تقسیم گیری کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔لہٰذا نظام اسلام نافذ کرنے کی سطح کے مطابق تقسیم کار و فرائض ہوسکتی ہے مثلاً حکومت کے بڑے بڑے عہدے مقننہ (آئین، تدوین قانون) عدلیہ، مجریہ (انتظامیہ) وغیرہ۔

بہرحال اس قسم کی ذمہ داریوں کی تقسیم میں بھی ایسی شق موجود ہونی چاہیۓ جس کے ذریعے بڑے اخلاقی مسائل میں قوت فیصلہ ایک ہاتھ میں ہوتا کہ کوئی مسئلہ بلا جواب باقی نہ رہے۔

ایک مجتہد جامع الشرائط جب کسی مسئلے میں بوجہ لزوم و حاکمیت حکم (فتویٰ حاکمیت) دیتا ہے تو باقی فقہاء کے لئے اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ فتویٰ حاکمیت ہر فرد پر نافذ ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیہ حاکم کی نسبت غیر حاکم فقہاء کا کیا حکم ہوگا؟ یقیناً فقیہِ حاکم کا حکم نافذ العمل ہوگا۔ اسلامی مصالح کے مطابق اس فقیہ کی حمایت کرنا واجب ہے جو فریضہ اسلامیہ پر قائم ہوتا ہے، شخصی مسائل کے علاوہ اجتماعی اور سیاسی مسائل کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔

بہرحال ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فقیہ جامع الشرائط کا انتخاب کون کرے گا؟ خاص کر فقہاء کی تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں۔

جواب یہ ہے کہ دور غیبت کبریٰ میں یقیناً یہ حق امت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔یعنی امت مسلمہ براہ راست یا بالواسطہ اپنا قائد منتخب کرنے کی مجاز ہے۔ بلکہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اسلام کی طرف سے اس پر مأمور بھی ہے۔

چنانچہ ایک فرد کے تعین پر نص خاص موجود نہ ہو اور امام معصومؑ کی طرف سے کوئی خاص نمائندہ بھی نامزد نہ ہوا ہو تو خود امت اسلامیہ پر اسلامی قواعد وضوابط کے تحت یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی متون (قرآن وحدیث) میں تعین شدہ شرائط وصفات کے مالک کسی بھی فرد کو اپنے

قائد کی حیثیت سے منتخب کر لے،اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔(انشاءاللہ)

شوریٰ اور ولایتِ فقیہ

اسلامی نظام کی نگاہ میں شوریٰ ایک مضبوط اور ایک ثابت بنیادی عنصر تصور کیا جاتا ہے جس کی اساس خود قرآن کریم میں موجود ہے ''وَاَمرُھُم شُورَیٰ بَینَھُم '' اس آیہ شریفہ کی تفسیر بطور تفصیل بعد میں بیان ہوگی۔فی الحال ہم شوریٰ کو بعنوان ایک مسلمہ حقیقت، قائد کے انتخاب میں دخیل سمجھتے ہیں۔

لہٰذا جہاں کوئی نص موجود نہ ہو اور حاکم اسلامی اور اسلام کی طرف سے امت اسلامیہ بحیثیت مجموعی کسی چیز کی انجام دہی پر مأمور ہو تو پھر قانون شوریٰ کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

ہم یہاں شیعہ سنّی کے درمیان خلافت کے موجودہ اختلاف کے حق میں اور نہ اس کے خلاف کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہر ایک اپنے اپنے نظریہ پر قائم رہتے ہوئے موجودہ زیر بحث مسئلہ (حاکمِ اعلیٰ کا انتخاب) کو حل کر سکتا ہے،اس لئے کہ شیعوں کے نظریے کے مطابق شوریٰ اور اجماع کی ضرورت نہیں تھی، چونکہ آنحضرتؐ اپنا جانشین مقرر فرما چکے تھے،اہل تسنن کے نظریے کے مطابق شوریٰ اور اجماع کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آنحضرتؐ نے اپنے جانشین کے طور پر کسی فرد کا تعین نہیں فرمایا تھا۔

لیکن دونوں فریق متفق ہیں کہ موجودہ دور میں اسلام اور رسول اسلامؐ کی طرف سے کسی خاص شخص کا تقرر ہوا ہے اور نہ کوئی نامزد ہوا ہے۔لہٰذا قانون اسلام کے اجراء اور حکومت اسلامیہ کی تشکیل کی ذمہ داری خود امت اسلامیہ پر عائد ہوتی ہے،اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر شخص نہ قائد بن سکتا ہے اور نہ قائد بننے کی صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے بلکہ امت اسلامیہ میں سے کوئی اس مقام پر فائز ہو جائے تو امت اسلامیہ اس کی پیروی کرے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص کون ہوگا؟اور کن صفات کا حامل ہوگا؟

یقیناً حاکم اسلامی بلا قید وشرط نہیں ہوسکتا۔ بلکہ قوانین اسلام،قرآن کریم کی آیات مبارکہ اور سنت مطہرہ کی روشنی میں عمومی صفات کا سراغ لگایا جاتا ہے خوش قسمتی سے شیعہ وسنی دونوں حاکمِ اعلیٰ کی بنیادی صفات پر تقریباً متفق نظر آتے ہیں، یہ بات الگ ہے کہ ان صفات کے حامل اوران کے مصداق کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

بہر حال شیعہ نظریہ کے مطابق عصر غیبت امام زمانہؑ میں حاکمِ اعلیٰ کی صفات وخصوصیات کا وافی وکافی، اسلام،قوانین ،سنت مطہرہ اور احادیث وفرامین معصومینؑ کے مطابق بیان ہو چکا ہے اوراس حاکم کا انتخاب بھی اسلامی اصول کے مطابق خود امت اسلامیہ پر لازم ہے،لہٰذا امت اسلامیہ بحیثیت مجموعی براہ راست یابالواسطہ اپنے قائد کاتعین کرسکتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ فقیہ جامع الشرائط جومسلمانوں کا رہبر ہے، کی تعداد ایک ہے یاایک سے زیادہ ہے۔فقیہ واحد ہونے کی صورت میں خودبخود اس منصب اعلیٰ پر فائز ہوجاتا ہے اورانتخاب کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی،لیکن اس صورت میں بھی زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر فقیہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خود جمہوری طور پر انتخاب کے ذریعے اس منصب پر فائز ہوسکتا ہے،اس انتخاب (ریفرنڈم) کے مثبت نتائج سیاسی اورعملی میدان میں یہ نکلتے ہیں:

ا۔لوگوں کوحق انتخاب دے کراحساس شرکت اور جذبہ مشارکت دیناجس کے ذریعے فقیہ حاکم لوگوں کواپنے اعتماد میں لیتاہے،تاکہ اپنے نفوذ اورقدرت ولایت کونافذ کرسکے۔

۲۔لوگ انتخاب کرتے ہوئے اپنے قائد کواطاعت وفرمانبرداری کا عہدوپیمان دیتے ہیں جوکہ فی الواقع امت اسلامیہ کی طرف سے اعتماد اور پورے اطمینان کا مظاہرہ تصور کیا جاتا ہے۔

۳۔اس انتخاب سے رائے عامہ (اسلام دشمن عناصر اور جمہوری ممالک کی رائے)ہموار ہوجائے گی،اور یہ اسلام دشمن پروپیگنڈے کا دندان شکن جواب بھی ثابت ہوگا اور عملی طور پرظاہر ہوجائے گا کہ اسلامی حکومت میں عوام الناس کا کردار کیا ہوتا ہے۔

متعدد فقیہ

فقیہ کی تعداد زیادہ ہو تو بھی صورت پہلے سے مختلف نہیں ہوگی۔لیکن انتخاب کی ضرورت اس صورت میں زیادہ محسوس ہوتی ہے کیونکہ قیادت واحدہ اس مرحلے میں اشد ضروری ہے البتہ یہاں ایک کی بجائے ایک سے زیادہ فقہاء کا انتخاب ہوسکتا ہے تا کہ وہ خود اپنے میں سے کسی کو منتخب کرلیں جس کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے۔

فقیہ کو امت مسلمہ براہ راست منتخب کرسکتی ہے مگر اس صورت میں کہ :

ا۔فقیہ کی تعداد صرف ایک ہو۔

۲۔جامع الشرائط فقہاء کا انتخاب کیا گیا ہو اور ایک قائد کے تعین کا مسئلہ خود ان فقہاء پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

۳۔امت مسلمہ کی فکری سطح اور نیک و بد کے ادراک کی قوت اتنی بلند ہو کہ اس سے مجموعی طور پر کسی غلطی کا امکان نہ ہو۔

لیکن اگر سطح فکر اور قوت ادراک اتنی بلند نہ ہو اور چند فقہاء میں سے کسی ایک کا انتخاب بھی کرنا ہو تو اس صورت میں امت مسلمہ اپنے قائد کا انتخاب بالواسطہ کرے گی، یعنی سب سے پہلے چند باصلاحیت افراد کو نمائندہ کے طور پر چنا جائے گا اور پھر ان نمائندوں کے ذریعے قائد اعلیٰ کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ بہرحال اس بحث کو مزید طول دینا بے فائدہ ہوگا۔

یادر ہے فقیہ کا انتخاب عمل میں آنے کے بعد یہ فقیہ کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ بذات خود اس منصب کو استعمال کرتا ہے یا اس کے لئے اپنی طرف سے کوئی نمائندہ نامزد کرتا ہے یا اپنے فرمان کے مطابق یہ عوام النّاس (امت اسلام) کے انتخاب پر چھوڑ دیتا ہے اور حکومتی اختیارات عوام کے منتخب کردہ فرد کے سپرد کر دیتا ہے اور خود بحیثیت ناظر و نگران کے اس کے عمل و حرکت پر نظر رکھتا ہے کہ وہ خطِ اسلام سے منحرف نہ ہونے پائے۔

ولایتِ فقیہ اور اہل تسنن

دورغیبت کبریٰ میں ولایتِ فقیہ کوقائم مقام امام زمانہؑ کی حیثیت سے بیان کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ مسلمانوں میں پہلے سے موجود اختلافات کوختم کرنے کی بجائے ایک نئے اختلاف کو ہوا دینے کے مترادف نہیں ہے؟ کیونکہ اہل تسنن کا نظریہ حکومت ولایتِ فقیہ کے اصول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کی بنیاد پہلے سے طے شدہ اصول وقواعد کے مطابق ہونی چاہیئے۔

اس سوال کو مزید تقویت اس وقت اور بھی ملتی ہے جب ایسے مما لک میں بھی جہاں اہل تسنن کی اکثریت ہے، اس نظریہ کو رائج کرنے یا فروغ دینے کی کوشش کی جائے، اس کی واضح مثال خود مملکت پاکستان ہے۔ اس قسم کے مما لک میں اس قسم کی فکر کی ترویج کرنا وحدتِ مسلمین کو تباہ کرنے کے مترادف نہیں ہے؟ جو کہ بالکل غلط فکر ہے۔

بہر حال اس موضوع ولایتِ فقیہ کے متعلق یقیناً بہت سے شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک مخلوط مملکت میں ولایتِ فقیہ کا تصور کس طرح کیا جاتا ہے؟ [1]

---

[1] اس موضوع کی مناسبت سے مجھے یاد آیا کہ چند سال پہلے پاکستان کے ایک اہل قلم نے اسلامی جمہوریہ ایران کا دورہ کرنے کے بعد ایک جریدہ سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایران کے قائدین کا اس بات پر اصرار ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کو برآمد کریں گے مگر اس کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایران کے علاوہ کون سا ایسا ملک ہے جس میں ایک فرقے کے ہزاروں کی تعداد میں علماء موجود ہوں۔

اہل قلم کے اس مضمون سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انقلاب برآمد کرنے ۔۔۔ باقی دوسرے صفحہ پر

یہاں پر ہم برادران اہل سنت سے یہ کہتے ہیں کہ اس طرح آپ پر شیعہ علماء اور شیعہ نظریات کی حکومت نہیں ہوگی اور نہ ولایت فقیہ کا مطلب یہ ہے۔ بلکہ آپ اپنے حاکم اعلیٰ اور قائد کا انتخاب علمائے اسلام (امین علماء) میں سے کریں ایک فاسق اور جاہل کو ولی امر ماننے سے یقیناً یہ بہتر ہے۔ کیونکہ جاہل اور فاسق کے ہاتھ میں صرف ڈنڈا اور طاقت ہوتی ہے اور وہ اسلامی قوانین سے بے خبر ہوتا ہے۔

"اَفَمَنْ يَهْدِىْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّىْ اِلَّا اَنْ يُّهْدٰى فَمَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ "

"جو شخص دین حق کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے (حکم کی) پیروی کی جائے یا وہ شخص جو (دوسرے کی ہدایت تو درکنار) خود ہی جب تک دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے وہ راہ دیکھ نہیں پاتا، تو تم لوگوں کو کیا ہو

پچھلے صفحے کا بقیہ ۔۔۔ کا مطلب دیگر ممالک میں شیعہ نظریات کو ٹھونس دینا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، کیونکہ اس کا مطلب طاقت برآمد کرنا نہیں ہے۔ انقلاب کو برآمد کرنے کا مطلب مظلوم قوموں کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کرسکیں۔ اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے اسلامی جمہوریہ ایران کے رہبران اور قائدین کے ہزاروں بیانات نقل کرنے کی بجائے یہاں پر رہبر کبیر انقلاب اسلامی امام خمینیؒ کے بیانات سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ انقلاب کو برآمد کرنے کا مطلب خود رہبر انقلاب کی زبان سے واضح ہو جائے۔

آپؒ فرماتے ہیں:

"ہم جو کہتے ہیں کہ ہمارا انقلاب تمام دنیا میں برآمد ہو، دوسرے افراد اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں کہ اس سے ہمارا مقصد فوجی فتوحات حاصل کرنا ہے جبکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ایرانی قوم کی بیداری سے دوسرے بھی فائدہ اٹھائیں اور استحصال پسندوں کے ہاتھوں کو اپنے قیمتی ذخائر سے کاٹ دیں اور تمام قوموں میں بیداری پیدا ہو جائے یہ ہماری آرزو ہے اور انقلاب برآمد کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ تمام اقوام اور حکومتیں جاگ اٹھیں اور اپنے آپ کو بڑی طاقتوں کے ظلم وستم سے آزاد کرالیں جو ہمارا خون چوس چوس کر اپنے پیٹ بھر رہی ہیں اور ہم اسی طرح فقیرانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔)

گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟'' (یونس. ۳۵)

برادران اہل سنت کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے امورات کو صحیح طور پر چلانے کے لئے بحثیت قائد ان علماء کا انتخاب کریں جو اسلام شناس، امین، عادل، حالات اور وقت کے تقاضوں سے واقف اور امت اسلامیہ کے خیر خواہ ہوں۔

بنابرایں نظریہ ولایت فقیہ سے نہ صرف ایک صحیح سمت کا تعین ہوتا ہے بلکہ پوری امت اسلامیہ کو ایک شاہراہ پر گامزن کرنے کی کوشش کا ایک صحیح راستہ بھی اس سے دکھائی دیتا ہے اور یہ امت اسلامیہ کو کئی سالوں کے خواب غفلت سے بیدار کر کے فاسق و فاجر، ظالم حاکم کے چنگل اور ظلم و ستم کے نتیجہ سے رہائی دلانا چاہتا ہے تا کہ ہر ایک مسلمان گروہ بحثیت مجموعی اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کر سکے۔

دوسری جانب اہل تسنن کے نظریات کا جائزہ لیا جائے تو لفظ ولایتِ فقیہ کا استعمال نظر نہیں آتا مگر نتیجہ وہی ہے جو ولایت فقیہ کی شرائط، صفات اور امتیازات سے ثابت ہے، یعنی ان کے نزدیک بھی حاکم اسلامی میں چند شرائط کا ہونا ضروری ہے، جس کے نتیجے میں حاکم اعلیٰ، حاکم بھی ہوسکتا ہے بلکہ بطریق اولیٰ۔

اب ہم برادران اہل تسنن کے چند مفکرین کے نظریات پیش کرتے ہیں:

ا۔ جناب ''باقلانی'' جن کا شمار اہل تسنن کے بڑے علماء میں ہوتا ہے، امام کی شرائط بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"..... ومنها ان يكون من العلم بمنزلة من يصلح ان يكون قاضياً من قضاة المسلمين..... ومنها ان يكون من امثلهم في العلم وسآئر هذه الابواب الّتي يمكن التّفاضل فيها الّا ان يمنع عارض من اقامة الأفضل فسوّغ نصب

المفضول "

"امام کی صفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ علم ومعرفت کے ایسے درجہ پر فائز ہو جو قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

جناب باقلانی چند صفات بیان کرنے کے بعد پھر رقمطراز ہیں:

"وہ (امام) باقی مسلمانوں میں علم اور قابل تفصیل مذکورہ صفات میں سب سے زیادہ افضل اور بہتر ہو، مگر اس وقت شرط افضلیت ضروری نہیں جب کسی وجہ اور ممانعت کے باعث افضل کو کھڑا کرنا خارج از امکان ہو۔" (التمهيد للباقلاني، ص ۱۸۱ بحواله الامامه فی التشريع الاسلامی، ص ۷۵ ۷۶)

اس عبارت کا لب لباب یہ ہوسکتا ہے کہ اسلامی روح، قوانین شریعت مطہرہ اور اصول اولیہ کے مطابق امام المسلمین کو سب سے بہتر اور افضل ہونا چاہئے لیکن حالات کے مطابق غیر افضل کو بھی ماننا پڑتا ہے جب افضل کا امکان نہ ہو یا اس کو منصب امامت پر فائز کرنے سے معذور ہو۔

۲۔ جناب "ابوالثناء" تحریر کرتے ہیں:

"صفات الأئمه تسع الأولیٰ: ان يكون الأمام مجتهداً فی اصول الدّين وفروعه....."

"امام مسلمین کی نو شرائط ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ امام کو اصول دین اور فروع دین میں مجتہد ہونا چاہئے۔۔۔" (مطلع الانوار ص ۴۷۰ بحواله الامامة فی التشريع الاسلامی ص ۷۷)

۳۔ جناب ''ابن حزم'' کا نظریہ:

''فلم یبق وجه یتمّ به الأمور آلا الأسناد الیٰ واحد. عالم،فاضل، حسن السیاسة.''

'' اصلاح امور کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی وجہ باقی نہیں ہے کہ امورات کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جائے جو عالم، فاضل اور نیک سیاست (دان) ہو۔'' (الفضل ج۴/ص۱۶۶ بحواله الامامة فی التشریع الاسلامی ص۷۷)

ابن حزم نے ایک اور جگہ امام کی شرائط کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اور چھٹی شرط کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''عالماً بما یلزم من فرائض الدّین ''

''امام (مسلمین) کے لئے دینی فرائض وواجبات کا عالم ہو نا ضروری ہے۔'' (الفضل ج۴/ص۱۶۶ بحواله الامامة فی التشریع الاسلامی ص۷۸)

۴۔ جناب ''تفتازانی'' شرائط وصفات امام کا ذکر کرنے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

''وزاد الجمهور الشرائط ،ان یکون شجاعاً ،مجتهداً فی الأصول والفروع.''

''علمائے جمہور نے امام کے لئے شجاع، اصول اور فروع دین میں مجتہد ہو نے کی شرائط کا اضافہ کیا ہے۔'' (شرح المقاصد ج۲/۲۷۷ بحواله الامامة فی التشریع الاسلامی. ص۷۹،۸۰)

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک شجاعت اور اجتہاد کو شرائط

امامت میں شمار نہ کرنے کی وجہ نصوص اسلامی میں کوئی تصادم اور تعارض نہیں ہے بلکہ یہ قحط الرجال کی بناء پر ہے۔

۵۔ جناب ''شریف جرجانی'' فرماتے ہیں:

"الجمهور علىٰ انّ اهل الأمامة ومستحقها هو مجتهد فى الأصول والفروع."

''علمائے جمہور کی رائے یہ ہے کہ مستحق امامت (مسلمین) وہ شخص ہے جو اصول وفروع میں مجتہد ہو۔'' (شرح المواقف ج۸/ص ۳۴۹ بحواله الامامة فى التشريع الاسلامى ص ۸۰)

۶۔ جناب ''فضل ابن روزبہان'' امامت کی شرائط کو بیان کرتے ہوئے عدالت کو ضروری قرار دیتے ہیں، آپ اشعری نقطہ نگاہ سے امامت کی تعریف کرنے کے بعد یوں لکھتے ہیں:

"شروط الأمام ان يكون مجتهداً فى الأصول والفروع ليقوم بأمر الدّين."

''شرائط وصفات امامت میں ۔۔۔۔۔اصول وفروع دین میں صاحب اجتہاد ہونا بھی شامل ہے تا کہ وہ دینی امور کو صحیح طور پر چلا سکے۔'' (دلائل الصدوق ج۲/ص ۹)

۷۔ جناب ''عضد الدّین الایجی'' شرائط امامت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"والجمهور علىٰ ان اهل ا لامامةمجتهد فى الاصول والفروع ليقوم بامور الدين ذورای يقوم بامور الملک، شجاع ليقوى علىٰ الغرب عن الحوزة."

''اکثر علماء کے نزدیک امام میں ان شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔اصول وفروعِ دین میں مجتہد ہو، تاکہ دینی معاملات کو صحیح طور پر چلا سکے۔

۲۔صاحب الرائے وبصیرت ہو، تاکہ امورِ مملکت کو بخوبی چلا سکے۔

۳۔شجاع ہو، تاکہ تمام اسلامی سرحدوں کا دفاع کر سکے۔"(المواقف ص ۳۹۸ بحواله مجله "الفجر" شماره ۲/سال ۱)

یہ تھے قدیم علماء کے نظریات، اب ہم تکمیل فائدہ کے لئے اہل تسنن کے چند جدید مفکرین اور علماء کے نظریات بھی پیش کرتے ہیں تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔

أ۔"عبد القادر عودہ"

آپ مصر کے نامور علماء میں سے ہیں، اور اسلامی تحریک کے معروف ترین داعی ہیں اور اسلامی نظام کا داعی ہونے کے جرم میں مصری حکام نے آپ کو شہید کر دیا۔آپ سربراہ اسلامی کی کئی شرائط کا ذکر کرتے ہوئے چوتھی شرط میں فرماتے ہیں:

"يشترط فى الأمام او الخليفة ان يكون عالماً ،واول ما يجب عليه علمه هو احكام الأسلام لأنّه يقوم علىٰ تنفيذها و يوجّه سياسة الدّولة فى حدودها،فأذا لم يكن عالماً بأحكام الأسلام لم يصح تقديمه للأمامة ،ويرى البعض انّه لا يكفى للأمام من العلم بأحكام الأسلام ان يكون مقلّداً لأنّ التقليدعندهم نقص،ويوجبون ان يكون مجتهداًلأنّ الأمامة فى رايتهم تستدعى الكمال فى الأوصاف و الأحوال،ولكن البعض الآخر يجيز ان يكون الأمام مقلّداً ولا يستلزم ان يكون مجتهداً"

''امام وخلیفہ کے لئے عالم ہونا شرط ہے اور سب سے پہلے اسلامی احکام کا جاننا اس کے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ اسی کو نافذ کرے گا اور مملکت کے سیاسی امور کو اپنی (اسلامی احکام) کی حدود میں چلائے گا۔ لہٰذا اگر وہ اسلامی احکام سے واقف نہ ہو تو اس کو امام قرار دینا درست نہیں ہے، بعض علماء کا نظریہ یہ ہے کہ اس کا اسلامی احکام میں مقلد (تقلید کرنے والا) ہونا کافی نہیں ہے، کیونکہ ان کے نزدیک تقلید کمال نہیں بلکہ یہ علم میں کمی کی دلیل ہے، لہٰذا اس کے لئے مجتہد ہونا لازمی ہے، کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق منصب امامت، امام میں اوصافِ کمال کا طالب ہے، مگر کچھ علماء کے نزدیک امام کے لئے مقلد ہونے کا جواز بھی موجود ہے اور وہ اس کے لئے اجتہاد کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے۔'' (الأسلام و اوضاعنا السیاسیة. ص ۱۱۸ تا ۱۱۹)

جناب عبدالقادر عودہ، امام اور خلیفہ میں عدالت کے ہونے کو لازمی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ویشترط فی الأمام والخلیفة ان یکون عدلاً، لأنّه یتولّیٰ منصباً یشرف علیٰ کل مناصب الّتی یشترط فیها العدالة، فکان من الأولیٰ ان تشترط العدالة فی منصب الأمامة او الخلافة.''

''امام اور خلیفہ میں عدالت کا ہونا شرط ہے کیونکہ وہ ایک ایسے عہدے پر فائز ہوتا ہے جس سے وہ ان تمام عہدوں پر ''جن میں عدالت ضروری ہے'' نگران اور سرپرست کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (الأسلام و اوضاعنا السیاسیة. ص ۱۱۸ تا ۱۱۹)

۲۔امام الحرمین ''الجوینی'' اپنی کتاب غیاث الأمم میں فرماتے ہیں:

''اس زمانے میں (جبکہ اسلامی معاشرہ حاکم جامع الشرائط سے خالی ہو) اسلامی نظام نافذ کرنے کے اہل صرف علماء ہیں، لہٰذا کوئی فرد یا گروہ جبراً اور قہر وغلبہ سے زمام حکومت اسلامی کو ہاتھ میں لے لے اور علماء کے فرامین کی مخالفت کرے تو اس کی امامت ساقط ہو جاتی ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔'' (بحوالہ روزنامہ کیھان عربی۔اقتباس از مقالہ ڈاکٹر محمد عبدالسلیم العوامصری)

۳۔''مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ'' اولی الأمر (سربراہ) کی شرائط بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''وہ ناداں اور جاہل نہ ہوں بلکہ ذی علم، دانا اور معاملہ فہم ہوں اور کاروبار خلافت کو چلانے کے لئے کافی ذہنی اور جسمانی اہلیت رکھتے ہوں۔'' (خلافت وملوکیت۔ص ۴۰)

چنانچہ ان کے نزدیک سربراہ اسلامی ظالم وفاسق نہیں ہوسکتا۔

''یہ کہ وہ (اولی الأمر) ظالم، فاسق وفاجر، خدا سے غافل اور حد سے گزر جانے والے نہ ہوں بلکہ ایماندار، خدا ترس اور نیکوکار ہوں۔کوئی ظالم اور فاسق اگر امارت یا امامت کے منصب پر قابض ہو جائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے۔'' (خلافت وملوکیت۔ص ۳۸)

(مزید اضافہ)

ولایتِ فقیہ اور علمائے اہل تسنن

ہم اصل کتاب'' ولایتِ فقیہ'' میں مذکورہ بالاعنوان کے تحت اہل سنت کے بعض علما ودانشوروں کے نظریہ وآراءنقل کر چکے ہیں جو علم ومعرفت کی شرط کے لحاظ سے نظریہ ولایتِ فقیہ سے چنداں اختلاف کے حامل نہیں ہیں بلکہ دراصل نظریہ ولایتِ فقیہ کے عین مطابق ہے اگرچہ عملی میدان میں اہل تسنن کو بھی یہ موقع میسر نہیں آیا کہ وہ اس نظریئے کو جامۂ عمل پہنائیں۔ فی الحال ہماری بحث نظریہ کی سطح پر جاری ہے اور میدانِ عمل میں تطبیق کرنا یا نہ کرنا ایک دوسرا مسئلہ ہے۔

ابھی ہم مزید وضاحت کی خاطر کچھ دوسرے علما واہل قلم کے نظریات نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین محترم کے ذہن سے یہ شبہ بالکل زائل ہوسکے کہ نظریہ'' ولایتِ فقیہ'' اس دور کے بعض فقہائے شیعہ وبالاخص حضرت امام خمینیؒ نے وقت کے تقاضوں کے مطابق یا اپنی ہوس اقتدار کی خاطر جعل کیا ہے اور یہ بات واضح ہوسکے کہ حاکم اورامام ووالیٔ مسلمین کے بارے میں تمام مذاہبِ اسلامیہ کے علماء ودانشمندوں کا اس بات پر اتفاق ہے یا کم ازکم اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ وہ عالم، مجتہد اور باصلاحیت ہونا چاہئے چنانچہ مذکورہ بالا نظریہ، نظریہ ولایتِ فقیہ کے عین مطابق ہے۔ مگر عملی میدان میں نظریہ سابق تطبیق نہ ہوسکا کیونکہ اہل سنت کے عوام الناس اور ان کے اکثر علماء حکامِ جور کے ہاتھوں یرغمال بنائے گئے اور سرکاری فقہاء سرکار کی پسند کے فتوے دیتے رہے اور جو علماء سرکاری پہنچ سے باہر رہے وہ کوئی مثبت اقدام کرنے سے عاجز رہے۔

لہٰذا علماء واہل فکر کا یہ پسندیدہ نظریہ عملاً منظر عام پر نہ آسکا۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں یہ

حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ علمائے شیعہ حاکمِ جور کی چکی میں پستے ہوئے آئے ہیں اورانہیں سیاسی مسائل پر توجہ دینے کا موقع میسر نہیں آیا اور ہمیشہ اپنے عقائد و نظریات کی حفاظت' تشریح اور اہل مذہب کی جان و مال کے تحفظ کی خاطر سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے گریز کرتے رہے۔ یہ موقف بذاتِ خود قابلِ تحسین تھا مگر غلامی کی زندگی نے اپنا اثر ضرور دکھایا اور اکثر علماء جمودِ فکری کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اس کے منفی اثرات آج تک بعض علماء کے نظریات و مواقف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

ا۔ ابوالحسن ماوردی

"وأما اهل الا مامة والشروط المعتبرة فيهم سبعة الثاني العلم المؤدي إلى الاجتهاد في النوازل و الاحكام"

ابوالحسن ماوردی اپنی معروف کتاب "الاحکام السلطانیہ" میں شرائطِ امام کی بحث میں لکھتے ہیں کہ "شرائط امام سات ہیں پہلی شرط عدالت اور دوسری شرط علم ہے کہ اتنا صاحبِ علم ہو کہ واقعات اور قانونی امور "احکام" میں اجتہاد کر سکے۔"

۲۔ قاضی ابویعلیٰ فرّا

"واما اهل الا مامة فيعتبر فيهم اربع شروط :الثاني ان يكون على صفة من يصلح ان يكون قاضيا من الحرية والعقل والعلم والعدالة الرابع ان يكون من افضلهم في العلم والدين..."

قاضی ابویعلیٰ فرّا لکھتے ہیں: "کہ علماء کے نزدیک امامت کے لئے چار

شرائط معتبر ہیں۔۔۔دوسری شرط آزادی، عقل، علم اور عدالت کے لحاظ سے اتنی صلاحیت کا مالک ہو کہ وہ قاضی بن سکے۔۔۔۔۔۔۔۔چوتھی شرط یہ ہے کہ علم و دیانت داری میں سب سے افضل و بہتر ہو۔" (ولایت فقیہ ج۱/۲۶۴ منتظری)

۳۔ابن خلدون

" العلم و العدالة و الكفاية "

ابن خلدون کے پاس شرائط امامت میں علم، عدالت اور صلاحیت معتبر ہیں۔" (مقدمہ ابن خلدون ص۲۱۶)!

۴۔صاحبِ "الفقہ علی المذاہب الاربعہ"

"إنهم اتفقوا على ان الامام يشترط فيه ان يكون . عالما مجتهدا."

صاحب کتاب "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" شرائط امامت میں تحریر کرتے ہیں: "کہ علماء کا جن شرائط پر اتفاق ہوا ہے ان میں سے علم اور اجتہاد بھی ہے۔" (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج۵/۴۱۶)

فقیہ کے حدود واختیارات

فقیہ حاکم کے حدود و اختیارات کا مفہوم سابقہ مباحث میں گزر چکا ہے چنانچہ ولایت کے معنی کے بیان میں ولایتِ تکوینی (کائناتی ولایت) اور ولایتِ تشریعی کے درمیان فرق اور ولایتِ فقیہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا تھا کہ فقیہ کے لئے بھی وہی اختیارات اور حدود ثابت ہیں جو رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کو میدان سیاست میں حاصل تھے۔ لیکن یہاں مستقل عنوان قرار دینے کا مقصد اس معنی کی مزید تشریح اور اسے اور زیادہ واضح الفاظ میں بیان کرنا ہے۔

توجہ رہے کہ فقیہ کے اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ فقیہ بحیثیت حاکم۔ ۲۔ فقیہ بحیثیت سرپرست اسلامی حکومت۔

ان دو مفاہیم کے درمیان فرق کا بیان درج ذیل ہے:

پہلی قسم کے اختیارات سے مراد وہ امورات اور کارنامے ہیں جو فقیہ کے لئے انجام دینا ضروری ہیں اور یہ براہ راست فقیہ کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔

اور دوسری قسم کے اختیارات بھی فقیہ کو حاصل ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ حکومت اسلامی کے اہداف اور نظریات کو بھی اسلامی معاشرے میں نافذ کرنا ضروری ہے لہٰذا اختیارات بحیثیت دیگر فقیہ کو حاصل ہونے کا نتیجہ ایک ہے۔ لیکن سہولت اور ایک نظریہ پیش کرنے کی غرض سے تاکہ زیادہ سے زیادہ اہداف و مقاصد اسلام سے نزدیکی اور آشنائی ہو، ہم دو عنوانوں سے بحث کرتے ہیں: ۱۔ فقیہ کے حدود و اختیارات۔

۲۔ حکومت اسلامی کے اہداف و مقاصد۔

پہلی قسم کا بطور خلاصہ جائزہ لیتے ہیں۔

فقیہ کے حدود و اختیارات

سابقہ مباحث میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ فقیہ کو بذات خود کوئی اختیارات حاصل نہیں ہیں بلکہ فقیہ کو بحیثیت خلیفہ و جانشین رسول اکرمؐ "خلفائی" اور ائمہ معصومینؑ " فأنهم حجّتی علیکم و انا حجّة الله " مقام ولایت و رہبری مسلمین حاصل ہے۔ لہٰذا فقیہ کو بھی وہ اختیارات حاصل ہوں گے جو رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کو حاصل تھے مگر وہ اختیارات اسے حاصل نہیں ہوں گے جن کے رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ سے مختص ہونے میں کوئی شک ہو یا مختص ہونے کا علم ہو، جیسا کہ جہاد ابتدائی (بناء بر مشہور) یعنی مشرکین و کفار سے جنگ کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے کرنے کا حق معصومینؑ کو حاصل تھا۔ آیا یہ حق اب فقیہ کو منتقل ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں شک پیدا ہونے کی صورت میں فقیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس حق کی منتقلی پر کوئی خاص دلیل ہونی چاہیے ورنہ اصل عدم انتقال ہے، البتہ یہ مسئلہ (جہاد ابتدائی) اسوقت اختلافی ہو جاتا ہے جب ادلہ تجویز جنگ و جہاد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ حکم صرف اور صرف معصوم سے وابستہ ہے اور غیر معصوم کسی بھی حالت میں اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکتا بلکہ غیر معصوم کا فریضہ اور ولایتِ نیابت کا حق صرف اسلامی ممالک کی حفاظت، بیرونی دشمنوں کے حملوں سے بچانا اور دفاع کرنا ہے۔ بہر حال اس مسئلہ پر کسی اور وقت مسئلہ جہاد پر بحث کرتے ہوئے بحث کریں گے۔ (انشاءاللہ) اب اصل مطلب پر آتے ہیں۔

فقیہ کے حدود و اختیارات درواقع دو قسم کے ہوتے ہیں جو کہ حکومت اسلامیہ کی تشکیل سے مربوط یا اس کے اہداف میں شمار کئے جاتے ہیں۔

۱۔ پہلی قسم وہ ہے، جب اس کام کی انجام دہی کے لئے کوئی خاص فرد موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہو لیکن اس کام کی اہلیت کا حامل نہ ہو مثلاً یتیم کے اموال، مجنون اور بے

عقل (سفیہ) کی جائیداد اوران افراد کی جائیداد کہ جن کے ذمے کسی کے قانونی حق کی وجہ سے اسے استعمال کرنے کی اجازت نہ ہو (محجور علیه) اوروہ اموال اور دولت جن کا مالک مجہول ہو وغیرہ، ان تمام اموال کی حفاظت اور نگہداشت کرنا۔

۲۔ دوسری قسم ان اختیارات کی ہے جن کا ہونا اسلامی حکومت کی بقاء کے لئے ضروری ہے، وہ تمام امور جو حکومت اسلامیہ سے مربوط ہیں اور بعض ایسے اختیارات بھی فقیہ کو حاصل ہیں جو اگر چہ حکومت کے دائرہ کار سے خارج کیوں نہ ہوں، جیسے فتویٰ دینا۔

اس لئے فقیہ کے اختیارات کے علاوہ اس کے فرائض کا بھی ذکر کیا جانا ضروری ہے۔

فقیہ کے اختیارات وفرائض

ا۔ اسلامی انفرادی اوراجتماعی مسائل کے مطابق فتویٰ دینا۔

۲۔ ترافع اور خصومات (دعاوی) میں قضاوت کرنا۔

۳۔ ایتام، مجہول المالک، مفلس، محجور اور مجنون و بے عقل افراد کی جائیداد کی نگہداری کرنا، اوقاف عامہ کی سرپرستی کرنا، اگر اس کا کوئی ولی اور سرپرست معین نہ ہو۔

۴۔ نظام اسلام کو بطور کامل معاشرہ پر نافذ کرنا اور حدود وتعزیرات کی بلا جھجک تنفیذ کرنا۔

۵۔ اسلامی معاشرہ میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر تعلیم وتربیت کو عام کرنا۔

۶۔ دینی اور اعتقادی مسائل سے متعلق شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا۔

۷۔ اسلامی معاشرہ میں عدل وانصاف کو فروغ دینا۔

۸۔ مسلمانوں کے اقتصادی مسائل حل کرنا اور محروم وفقیر کو اجتماعی ضمانت (التکامل الأجتماعی) کے تحت حقوق دلانا۔

۹۔ خراج، خمس اور زکوٰۃ وغیرہ کو بیت المال میں جمع کروانا اور مستحقین میں تقسیم کرنا۔

۱۰۔ داخلی امن قائم کرنا اور ہر ایک کی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کا ذمہ لینا۔

۱۱۔ ہر ایک کی شخصی آزادی کی حفاظت اسلامی قانون کے تحت کرنا اور مساوی حقوق دلانے کے مواقع فراہم کرنا۔

۱۲۔ مملکت اسلامیہ کو بیرونی دشمنوں کے حملوں اور خطرات اور داخلی شر پسند عناصر کی سرگرمیوں سے محفوظ رکھنا۔

۱۳۔ ہر قید و بند سے انسان کو آزاد کرانے کی کوشش کرنا۔

۱۴۔ دنیا کی مظلوم اور محروم قوموں کی حمایت کرنا، اس میں مسلمانوں کو اولیت حاصل ہوگی پھر اہل کتاب اور اس کے بعد ہر انسان ہے۔

اس طرح ان سب کو ظالموں سے مقابلہ کرنے میں مدد دینا حکومت کے اہداف میں سے ایک اہم ہدف ہوگا۔

۱۵۔ قانون اسلام، قرآن وسنت معصومینؑ میں اگر کوئی خاص نص موجود نہ ہو تو حکومت اسلامی کو چلانے کے لئے اسے نئے قوانین بنانے کا حق حاصل ہوتا ہے، مگر یہ قانون (حکم ثانوی) اسلام کے عام قوانین اور قواعد کلیہ یا مزاج اسلام کے مخالف نہیں ہونا چاہئے، اور ہر وہ قانون مسترد اور بے معنی تصور کیا جائے گا جو اسلام کے نص صریح کے خلاف ہو۔

ہم نے یہاں چند ضروری اور بنیادی باتیں بطور فہرست بیان کی ہیں انشاء اللہ حکومت اسلامی کے اہداف و مقاصد کا تفصیلی جائزہ کسی اور مناسب وقت پر لیا جائے گا جو ایک مستقل کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔

اسلامی حکومت استبدادی حکومت نہیں

مذکورہ عنوان کے تحت ایک مستقل و مفصل بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فقیہ عادل کی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسلامی حکومت ایک استبدادی حکومت کی خصوصیت

اختیار کر لیتی ہے، بہت ناانصافی کی بات ہوگی۔

درواقع حقیقت یہ ہے کہ حکومت اسلامی میں استبداد اور خود مرکزی کا کوئی مفہوم نہیں ہے، جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ بے علمی، کم توجہی اور اسلامی نظام کی حقیقت سے روشناس نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

عموماً یہ سوال کیا جاتا، یا اسلام دشمن عناصر کی طرف سے مسلمانوں کو اپنے نظریہ حیات سے دور رکھنے کی غرض سے اٹھایا جاتا ہے کہ اسلام میں حاکمیت تو اللہ کی ہوتی ہے اور حکم الٰہی میں دخل دینے کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی۔ دوسری طرف خود ذات خدا براہ راست لوگوں پر حکومت نہیں کرتی بلکہ وہ اپنے بندوں میں سے چند ایک افراد کو اس غرض کی تکمیل کے لئے منتخب کرتی ہے جو رسول اور نبی کے نام سے معروف ہیں۔

تیسری طرف زمانہ غیبت کبریٰ میں نظریہ ولایت فقیہ کے تحت انبیاءؑ اور ائمہ معصومینؑ کے تمام سیاسی، دینی اور دنیاوی امور چلانے کے اختیارات فقیہ کو حاصل ہے اور ولی فقیہ کے حکم کو تسلیم نہ کرنا نبی کے حکم کو تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے، جو دینی اصطلاح میں ارتداد اور دین سے خارج ہونے کے معنی دیتا ہے۔ لہٰذا فقیہ کے حکم پر بلا چون و چرا عمل کرنا ضروری ہے، جیسا کہ ایک ظالم حکومت میں رعایا کی حالت ہوتی ہے کہ اسے اظہار رائے کا موقع کسی طرح بھی نہیں دیا جاتا۔ اور جابر حاکم جب بھی چاہے اور جس قدر چاہے عیاشی اور شہوت پرستی میں مشغول ہوسکتا ہے۔

یہ سوال درواقع اسلامی حکومت کے صحیح نظریات، تصور اور ولی فقیہ و حاکم اعلیٰ کی شرائط وصفات سے ناواقفیت کی وجہ سے پیش آتا ہے۔ اگر یہ سائل ولی فقیہ اور حاکم کے لئے مقرر شدہ شرائط کا بغور مطالعہ کر لیتا تو یہ گمان اس کے ذہن سے دور ہو جاتا۔

کسی بھی جمہوری حکومت کے آئین کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بالآخر حکومت کی باگ ڈور یعنی آخری فیصلہ کرنے کا اختیار کسی ایک کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کہیں صدر

مملکت اس اختیار کا مالک ہے تو کہیں وزیر اعظم۔ مگر اس نظام پر کوئی اعتراض نہیں کرتا اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس حکومت میں آزاد خیالی نہیں ہے اور یہ حکومت ایک آزادانہ حکومت نہیں ہے۔

فرق اتنا ہے کہ باقی حکومتوں میں صدر یا وزیر اعظم کا انتخاب ایک معینہ مدت کے لئے کیا جاتا ہے مگر ولی فقیہ کے لئے مدت معین نہیں ہوتی۔

اسلامی حکومت میں ولی فقیہ آمرانہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ اسلامی نظام کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے فقیہ حکومت کے عہدہ وسرپرستی سے بذات خود معزول ہو جاتا ہے، اور اس منصب ولایت کا مستحق نہیں رہ جاتا۔

آمرانہ حکومت اور اسلامی حکومت میں چند بنیادی فرق موجود ہیں:

۱۔ اسلامی حکومت میں قانون سازی کا حق صرف اور صرف اللہ کو حاصل ہے۔ ولی فقیہ کو اسلامی نظام کے برعکس یا اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق کوئی قانون بنانے کا حق حاصل نہیں ہوتا جب کہ آمرانہ حکومت میں قانون کی بنیاد اور ہر سیاہ وسفید کا مالک ہونے کی اساس اس کی کرسی، تخت یا سلطنت ہے اور جب بھی وہ چاہے اپنے مفاد اور اپنی کرسی کی حفاظت کے لئے کسی بھی قانون کو بنانے یا منسوخ کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۲۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ فقہاء جامع الشرائط متعدد ہونے کی صورت میں ہر ایک اس مقام کا مستحق ہے۔ اگر ایک فقیہ حاکم اسلامی نظام کی خلاف ورزی کرے یا ایسا فتویٰ دے جس سے اسلامی مفاد عامہ کو زیادہ نقصان پہنچے اور اس حکم پر خاموشی اختیار کرنے سے مصلحت عامہ سے زیادہ مفسدہ ہو تو باقی فقہاء پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکم کو نقض (مسترد) کریں۔

یہ امر بھی دور از حقیقت نہیں ہے کہ فقیہ حاکم کی نگرانی کے لئے فقہاء یا کم سے کم علمائے اسلام پر مشتمل ایک مجلس نظارت تشکیل دی جائے تا کہ بوقت ضرورت فقیہ حاکم کے سلوک و رویہ کا جائزہ لیا جائے اور عمداً غلطی کا مرتکب ہونے کی صورت میں اسے منصب ولایت سے معزول کر دیا جائے۔ حقیقت میں تو وہ خود معزول ہو جاتا ہے لیکن عوام الناس کو باخبر کرنے کے لئے اس کی

معزولی کا اعلان ضروری ہے جبکہ آمرانہ نظام حکومت میں ایسا نہیں ہوتا۔

۳۔اسلامی نظام حکومت میں فقیہ کو جو ولایتِ عامہ حاصل ہے وہ بغیر شرط وقید حاصل نہیں ہے بلکہ ولایتِ عامہ ایسی چند بنیادی شرائط پر قائم ہے جن میں سے ایک مفقود ہو جائے تو ولایت بھی ختم ہو جاتی ہے۔(ان شرائط کا ذکر پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے) مگر استبدادی نظام میں حاکم کے لئے کوئی شرط مقرر نہیں، آیا یہ معقول بات ہے کہ ان تمام شرائط کے باوجود اسلامی حکومت ایک استبدادی اور آمرانہ حکومت میں تبدیل ہو جائے؟۔

ولایتِ فقیہ میں مفاد عامہ اور مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت ملتی ہے اور اس میں استبداد بہ رائے جائز نہیں ہے، اگر مفاد عامہ اور ماحول کے تقاضا کی وجہ سے کبھی اور کسی زمانے میں ایسا ہو کہ کوئی حکم نافذ کرنے سے پہلے عوام الناس سے استصواب رائے کرنے میں مصلحت موجود ہو تو مذکورہ مسئلہ میں عوام الناس سے مشورہ لینا ضروری ہے۔ یاد رہے کہ یہ حکم اس حکم کے بارے میں ہے جس کے متعلق قرآن وسنت معصومینؑ میں حکم صریح یا نص موجود نہ ہو اور اس خالی محل کو پُر کرنا فقیہ پر بوجہ مجتہد فرض ہو۔

حکم ثانوی یعنی زمانے کے تقاضوں کے مطابق بنائے گئے حکم کو دو طریقوں سے نافذ کیا جاتا ہے:

۱۔وضع شدہ حکم، جو خود فقیہ نے بنایا ہے یا باصلاحیت افراد کے ذریعے بنایا گیا ہے، ولایتِ فقیہ کے مطابق براہ راست نافذ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔پہلی صورت مفاد عامہ کے برخلاف ہو تو فقیہ حاکم پر فرض ہے کہ مذکورہ حکم نافذ کرنے کی بجائے لوگوں سے مشورہ لے یا استصواب رائے کے بعد نافذ کرے۔

استبدادی اور آمرانہ حکومت میں اس قسم کی رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس بناء پر اسلامی حکومت میں استبدادی اور آمرانہ رویہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

ولایتِ فقیہ اور فقہائے اسلام

نظریہ ولایتِ فقیہ کے اثبات میں جو دلائل پیش کئے تھے وہ کافی تھے اور کسی چیز کی تائید ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر نظریہ ولایتِ فقیہ سے لوگوں کی عموماً غفلت اور عدم آ گاہی، ایک طرف اور دور حاضر میں اس کو ایک مستقل اور اسلام کے اصول ونظریات کو نافذ کرنے کا بہترین اور منطقی ترین طریقہ کے طور پر پیش کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظریہ ولایتِ فقیہ کہاں تک علمائے متقدمین کے نزدیک مقبول تھا؟ اور آیا علمائے سابقین میں سے کوئی اس نظریہ کا قائل تھا بھی یا نہیں؟ یا یہ نظریہ دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بعض علماء کی طرف سے پیش کیا گیا ہے؟

اس سوال کا جواب اسلامی فقہ کی کتابوں میں واضح طور پر موجود ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ نظریہ کوئی جدید نظریہ نہیں ہے بلکہ نظریہ امامت کے مکمل فوائد اسی نظریہ پر موقوف ہیں، جیسا کہ کئی دفعہ ذکر ہو چکا ہے اور بہت سے فقہائے اسلام نے اپنی کتب میں اس نظریئے کی تشریح کی ہے۔ اس کے علاوہ کئی علماء اس نظریئے کو متفق علیہ نظریہ کے طور پر تسلیم کر چکے ہیں، ہم صرف بعض نامور علماء کی فہرست مع تشریح پیش کرتے ہیں تا کہ مذکورہ سوال کا جواب صحیح طور پر دیا جا سکے۔ یاد رہے اس سوال کا ایک پہلو یہ بھی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ اس پر کوئی ٹھوس اور واضح دلیل موجود نہیں ہے جیسا کہ سابقہ بحث سے ظاہر ہو چکا ہے، اس لئے ہم یہاں تکرار نہیں کرتے۔

محقق کرکیؒ

آپؒ کا شمار بزرگ علمائے اسلام میں ہوتا ہے، آپؒ فرماتے ہیں:

"اتفق اصحابنا علیٰ انّ الفقیه العادل الأمین الجامع الشرائط الفتویٰ۔ المعبّر عنه بالمجتهد في الأحکام الشّرعیّة نائبٌ من قبل ائمّة الهدیٰ فی حال الغیبة فی جمیع ما للنّیابة فیه مدخل۔"

"ہمارے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ زمان غیبت (امام زمانہؑ) میں فقیہ عادل، امین، جامع الشرائط فتویٰ (احکام شرعیہ میں فتویٰ دینے کی صلاحیت کا مالک) جس کو مجتہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، ائمہ ہدیٰؑ کے ان تمام امورات ومعاملات میں نائب ہے جن میں نیابت کو دخل ہے۔" (انتظار الامام۔ ص ۱۰۲)

فیض کاشانیؒ

"و کذا اقامة الحدود والتعزیرات وسآئر السیاسات الدینیّة، فأنّ للفقهآء المؤمنین اقامتها فی الغیبة بحقّ النیابة عنه علیه السلام لأنّهم مأذونون من قبلهم علیهم السلام۔ فی امثالها کالقضآء والأفتآء وغیرهما۔"

"اسی طرح حدود وتعزیرات اور باقی سیاست دینیہ جاری اور نافذ کر سکتے ہیں، کیونکہ فقیہ مومن زمانہ غیبت میں امام زمانہؑ کے نائب ہونے کی وجہ سے مذکورہ امورات (حدود وتعزیرات) نافذ کر سکتے ہیں، چنانچہ فقہائے عظام قضاوت اور فتویٰ وغیرہ دینے میں مجاز ہیں۔" انتظار امام۔ ص ۱۰۵)

صاحب الجواہرؒ

آپؒ کی شخصیت تعریف کی حدود سے باہر ہے اور آپؒ فقہ کے آسمان پر سورج کی طرح چمکے اور چمکتے رہیں گے۔ آپؒ کی کتاب ''جواھر الکلام'' جو فقہ اسلامی میں بے نظیر ہے۔ ہمارے مدعا کا روشن گواہ ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

''انّ المقتضی الأمام الحد قائم فی صورتی، حضور الأمام وغیبته، ولیست الحکمة عآئدة الیٰ مقیمهٖ (الأمام) قطعاً فتکون عآئدة الیٰ مستحقّهٖ (نائب الأمام فی حال الغیبة) والیٰ نوع المکلفین (یعنی الأمة الأسلامیة) ''

''امام زمانہؑ کے حضور اور غیبت، دونوں حالتوں میں حدود و تعزیرات نافذ کرنے کے تقاضے اور علل یکساں طور پر موجود ہیں۔ اور اس (نظام اسلام نافذ کرنے) کا فلسفہ صرف امام زمانہؑ کی موجودگی اور ان کی ذات گرامی سے وابستہ نہیں بلکہ امام زمانہؑ کے نائب اور پوری امت اسلامیہ سے بھی مربوط ہے۔'' (فی انتظار الامام ص ۱۰۲)

السّید البروجردیؒ

''یقول بعد الأستدلال علیٰ ضرورة نصب من یرجع الیه الشیعة من قبل الأئمة (ع) ... واذا ثبت هٰذا البیان النصب من قبلهم وانّهم لم یهمل هٰذهٖ الأمور المهمّة الّتی لا یرضی الشارع بأهمالها، ولا سیّما مع احاطتهم بحوائج شیعتهم فی عصر الغیبة فلا محالة یتعین الفقیه لذٰلک، اذ لم یقل احد بنصب غیرهٖ فالأمر یدور بین عدم النصب وبین

نصب الفقیہ العادل ۔ واذا ثبت بطلان الأوّل، بما ذکرنا، صار نصب الفقیہ مقطوعا بہ "

آقائے حسین طباطبائی بروجردیؒ جواپنے دور میں پوری شیعیت کے مرجع اور پیشوا تھے۔ زمانہ غیبتِ امامؑ میں شیعوں کے ایک رہنما کی ضرورت پر روشنی ڈالنے کے بعد فرماتے ہیں:

"۔۔۔۔۔ جب مذکورہ بیان سے یہ ثابت ہوا کہ امام زمانہؑ کی جانب سے کوئی منصوب کیا گیا ہے اور اسے ضروری امورات (جن کے ترک کرنے پر اللہ راضی نہیں ہوتا) کا حکم بیان کئے بغیر نہیں چھوڑا، نیز ائمہ ہدیٰ زمانہ غیبت میں شیعوں کی ضرورت سے آگاہ بھی تھے۔ لامحالہ (نتیجہ یہ نکلتا ہے) مذکورہ امورات کی انجام دہی میں فقیہ عادل کو منصوب کیا ہے اور فقیہ عادل کے بغیر کسی اور کے نصب کئے جانے پر کوئی بھی قائل نہیں لہٰذا امر واقع کا دارومدار دونوں صورتوں میں سے ایک پر ہے:

۱۔ کسی کو نصب نہیں کیا گیا۔

۲۔ فقیہ عادل کو منصوب کیا گیا ہے۔

جب ہم نے پہلی صورت کا بطلان واضح کیا تو صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے یعنی فقیہ عادل کو منصوب کیا گیا ہے۔ (فی انتظار الامام ص ۱۰۷ بحوالہ البدر الزاھر فی صلاۃ الجمعۃ والمسافر).

شیخ محمد حسین کاشف الغطاءؒ

آپؒ تعریف وتوصیف سے بالاتر ہیں اور آپؒ عالم اسلام کے عالم اور مصلح تھے، آپؒ سے مختلف قسم کے سوالات کئے گئے، ان میں سے ایک ولایتِ فقیہ کے متعلق تھا۔ یہ اصل سوال مع جواب پیش خدمت ہے۔

"السؤال.عموم الولاية الفقيه في زمن الغيبة ثابت ام لاافيد وفأمّا هو المحقق عندكم في ذٰلک .....؟

الجواب.الولاية على الغير لها ثلاث مرّات.

الأولىٰ:ولاية اللّٰه جلّ شأنه ولرسول الله والأئمّة الّتي اولىٰ بالمؤمنين من انفسهم.

الثانية :ولاية الفقيه المجتهد النآئب عن الأمام وهي طبعاً اضيق من الأولىٰ والمستفاد من مجموع الأدلة انّ له الولاية على الشئوون العامّة وما يحتاج اليه نظام الهيئة الأجتماعيّة المشار اليه بقولهم عليهم السلام(مجارى الأمور بأيدى العلمآء،والعلمآء ورثة الأنبيآء وامثالها)(ثم يذكر عدة امثلة لذٰلک ويقول :)وكثير من امثال ذٰلک مما لا بد منهم وعدم الأمكان تعطيله ولعل من هٰذا الباب "عدم امكان تعطيله"اقامة الحدود مع الامكان وامن الضرر وبالجملة فالعقل يدل علىٰ ولاية الفقيه الجامع علىٰ مثل هٰذاالشئوون فأنّهالأمام المعصوم اولا او للفقيه المجتهد بالنّيابة المجعولة لقوله عليه السلام "وهو حجّتي عليكم وانا حجّة اللّٰه....."

سوال:۔آیا زمانہ غیبت میں فقیہ (مجتہد) کے لئے ولایت عامہ ثابت ہے یانہیں؟نظر یئے سے ہمیں مستفیض فرمائیں۔

جواب:۔کسی دوسرے پرولایت اور سرپرستی کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ۔خدا کی ولایت ہے جو کہ تمام کائنات پر نافذ ہے،اور رسول اکرمؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کی ولایت،خدا کی ولایت کا ایک کرشمہ ہے''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ''یعنی: نبیؐ مومنین کے نفوس سے اولیٰ ہیں۔

دوسرا درجہ۔نائب امامؑ اور مجتہد وفقیہ کی ولایت وسرپرستی ہے جس کا دائرہ کار پہلے درجے کی ولایت سے ایک حد تک محدود ہے لیکن مجموعی ادلہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ (مسلمین کے) امور عامہ اور اجتماعی امور کے نظام کے متعلق ولایت ثابت ہے اسی طرح ائمہ اہل البیتؑ کے کلام میں اشارہ ملتا ہے کہ تمام معاملات اور امور علماء کے ذریعے قابل نفاذ ہیں اور علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں وغیرہ۔

پھر چند ضروری امور اوران کے معطل نہ ہونے کی ضرورت بیان کرنے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

''شاید قدرت ہوتے ہوئے اور نقصان سے محفوظ رہ کر حدود نافذ کرنا اور اسی باب (امر بالمعروف ونہی از منکر) اوران امورات میں شمار ہوتا ہے جو کہ بغیر نفاذ کے معطل رکھنا جائز نہیں۔''

خلاصہ کلام یہ کہ عقلی اور نقلی دلائل اس بات پر قائم ہیں کہ مذکورہ امورات عامہ پر فقیہ جامع الشرائط کی ولایت وسرپرستی ثابت ہے،کیونکہ یہی ولایت اصل میں امام معصومؑ کے لئے ثابت تھی،پھران کے فرامین کے مطابق فقیہ مجتہد کے لئے بحق نیابت ثابت ہے۔چنانچہ امام زمانہؑ نے فرمایا''وہ تم پر ہماری طرف سے حجت ہیں اور ہم ان پر خدا کی طرف سے حجت ہیں۔''(الفردوس الاعلیٰ۔ص۳۵،۳۶)

الشیخ احمد نراقیؒ

آپؒ صاحب کتاب ''مستند الشیعہ فی احکام الشریعۃ'' ہیں۔آپؒ کے تمام متعلقہ پہلوؤں پر تحقیقی گراں بہا سعی وکاوش کا ایک نمونہ ہیں۔ولایتِ فقیہ کے سلسلے میں آپؒ یوں رقمطراز ہیں:

''کل ما کان للنّبیّ والأمام الّذین ھم سلاطین الأنام وحصون الأسلام،فیہ الولایة وکان لھم فللفقیہ ایضاً ذٰلک اّلا ما اخرجہ الدّلیل من احماع او نصّ او غیرھما الیٰ ان یقول فھو وظیفة الفقیہ ولہ التّصرف فیہ والأتیان بہٖ فمنّا الأفتآء فلھم ولایتہ علی الرعیّة وجوب اتباعھم فی فتاواھم وتقلیدھم فی احکامھم.''

''جہاں نبیؐ اور امامؑ کے لئے ولایت (حکمرانی) حاصل ہے وہاں فقیہ کے لئے بھی ولایت حاصل ہے مگر وہ باتیں جن کو دلیل نے مستثنیٰ قرار دیا ہو۔آگے کہتے ہیں جو امور لوگوں کے دین اور دنیا سے مربوط ہیں ان کا بجا لانا ضروری ہے، پھر فرماتے ہیں: فقیہ کا فریضہ یہی ہے اور ان کو تصرف کرنے کا حق حاصل ہے جہاں فتویٰ دینا واجب ہے رعیت پر ان کی اتباع واجب ہے اور احکام (اسلام) میں تقلید کرنا بھی ضروری ہے۔''

اس کلمہ کا ذکر کرنے کے بعد آپؒ دلیل کے ساتھ فقیہ کی ذمہ داریاں فرداً فرداً بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فقیہ کے وظائف میں سے ایک وظیفہ فتویٰ دینا ہے اور ان کے فتویٰ کی اتباع اور احکام شرعیہ میں اس کی تقلید کرنا رعیت پر واجب ہے۔''(عوائد

الایّام بحوالہ مجلّہ" التوحید"سال دوم شمارہ ۷)

جناب شیخ احمد نراقیؒ نے فقیہ کے وظائف میں حدود وتعزیرات کو شمار کیا ہے، پھر غیبتِ کبریٰ کے دور میں اس مسئلہ میں علماء کے درمیان کچھ اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومنها الحدود والتعزیرات اختلفوا فی ثبوت ولایتها للفقیه فی زمن الغیبة ، فذهب الشیخان الیٰ ثبوتها له واختاره الدّیلمیؒ والفاضلؒ فی کتبه والشهیدانؒ وصاحب المهذّبؒ و صاحب الکفایةؒ والشیخ الحرّؒ بل اکثر المتأخرین ونصب الی المشهور بل ادعیٰ بعضهم علیه الأجماع ونقل عن الحلّیؒ منعها والشرائع والمنافع التردّد."

"زمانہ غیبتِ کبریٰ میں علماء میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا حدود وتعزیرات نافذ کرنے کی ولایت واختیارات فقیہ کو حاصل ہیں یا نہیں؟ ثبوت کے نظریئے کے حق میں شیخ مفیدؒ، شیخ طوسیؒ، سلاّر دیلمیؒ، ابن ادریسؒ، شہید اولؒ، شہید ثانیؒ، صاحب کتاب مہذبؒ، صاحب کتاب کفایہؒ اور حرِ عاملیؒ صاحب وسائل الشیعہ ہیں، بلکہ اکثر علمائے متاخرین کے نزدیک یہی نظریہ مشہور ہے، بعض علماء نے یہاں تک بتایا ہے کہ اس مسئلہ پر اجماع قائم ہے اور علامہ حلیؒ سے نفی منقول ہے لیکن محقق حلیؒ مذکورہ نظریہ میں متردّد نظر آتے ہیں۔" (مجلّہ "التوحید" سال ۲ شمارہ ۸ ص ۵۴)

خلاصہ کلام

مقامِ ثبوت میں فقیہ جامع الشرائط کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو رسول اکرمؐ کے لئے اپنے دورِ حکومت میں ثابت تھے، اور رسولؐ کے بعد ان کے جانشین برحق ائمہ معصومینؑ کو منتقل ہوئے، یاد رہے رسول اکرمؐ اور امامؑ کے اختیارات صرف مسئلہ گوئی میں منحصر نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے سیاہ وسفید پر ولایت رکھتے ہیں "النّبیّ اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم" یعنی: نبیؐ مومنین کے نفوس سے اولیٰ ہیں۔ "من کنت مُولاہ فھٰذا علیٌّ مولاہ۔"

"جس کا میں مولا ہوں پس اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔"

چنانچہ فقیہ کو یہ تمام اختیارات حاصل ہیں۔

ان کے کلام کا ایک پہلو چند وہ مصادیق ہیں جو بعنوان فریضہ مجتہد بیان کئے گئے تھے ہم اختصار کے پیش نظر صرف تین چیزوں کا ذکر کرتے ہیں ان میں سے دو "فتویٰ دینا" اور "حدود وتعزیرات نافذ کرنا" کا ذکر ہو چکا ہے اب تیسری چیز "قضاء" کا ذکر کرتے ہیں:

"ومنھا القضآء فلھم ولایت القضآء والمراجعات وعلی الرعیّة الترافع الیھم وقبول احکامھم۔"

"ان میں سے ایک قضاوت (فیصلہ) کرنا ہے فقیہ کو فیصلہ کا حق حاصل ہے، رعیت پر واجب ہے کہ وہ فیصلے ان سے کرائیں اور ان کے احکام کو قبول کریں۔"

یاد رہے ہم سابقہ ایک عنوان "مفہوم فقیہ اور فقہائے اسلام" کے تحت دور حاضر اور اسلام کے دو عظیم خدمت گزاروں، آیت اللہ العظمیٰ حضرت امام خمینیؒ اور آیت اللہ العظمیٰ شہید السید محمد باقر الصدرؒ کے گراں بہا نظریات بیان کر چکے ہیں اور ان کا ذکر دوبارہ نہیں کرتے۔

پایان۔۲۔شعبان ۱۴۰۵ھ۔۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء

(مزید اضافہ)

ولایتِ فقیہ اور فقہائے اسلام کے اقوال

ولایت فقیہ اور فقہائے اسلام کے عنوان سے ہم اصل کتاب میں بہت سے علماء کے اقوال نقل کر چکے ہیں تاہم نظریہ ولایت فقیہ کی مزید وضاحت کی غرض سے دیگر علما اسلام کے اقوال ونظریات نقل کر رہے ہیں تا کہ محترم قاری کے ذہن سے یہ شبہ ہمیشہ کے لئے نکل جائے کہ جو کہا جاتا ہے کہ نظریہ ولایت فقیہ حضرت امام خمینیؒ اور ان کے ہم خیال علما کی ایجاد کردہ ہے دراصل شیخ مفیدؒ سے لے کر آج تک یہ نظریہ فقہ شیعہ کا حصہ اور عقائد امامیہ کا غیر انفکاک تسلسل کی ایک کڑی ہے اگر چہ یہ نظریہ عملی میدان میں سیاسی اور سماجی سطح پر مدوجزر کا شکار رہا ہے۔

کتب فقہ میں مزید علما کے اقوال پائے جاتے ہیں مگر ہم بوجہ اختصار نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ا۔ شیخ مفیدؒ (ولادت ۳۳۳ یا ۳۳۸ وفات ۴۱۳ھ)

"فاما اقامة الحدود فهو الى سلطان الاسلام المنصوب من قبل الله تعالى وهم ائمة الهدى من آل محمدؑ او من نصبوه لذالک من الامراء والحكام وقد فوضوا النظر فيه الى فقهاء شيعتهم مع الامكان، فمن تمكن من اقامتها ... وكذالک ... من قومه فقد لزمه اقامة الحدود عليهم فليقطع سارقهم وليجلد زانيهم ويقتل قاتلهم .."

''۔۔۔۔اور حدود الٰہی کو نافذ کرنے کا مسئلہ اللہ کی جانب سے منصوب شدہ سلطان اسلام سے مختص ہے یہ آل محمدؐ میں سے ائمہ ہدیٰ ہیں یا وہ حاکم وامیر ہیں جو ائمہ ہدیٰ کی جانب سے اس غرض کے لئے منصوب کئے گئے ہیں بے شک ائمہ اہل اہل بیتؑ نے بصورت امکان وقدرت اس سلسلہ ''اجرا حدود'' میں غور وفکر کرنے کو فقہائے شیعہ کے سپرد کیا ہے۔ پس اگر کوئی فقیہ اجراء حدود پر قدرت رکھتا ہو اسی طرح، یا صرف اپنی قوم پر نافذ کر سکتا ہو تو ان پر اجرائے حدود لازم ہے لہٰذا وہ چور کا ہاتھ کاٹ دے، زانی پر تازیانہ مارے اور قاتل کو قتل کرے۔'' (متاہات فی مدینۃ الضباب ج ۲/ص ۲۵۹)

۲۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ

'' ولم يزل الصالحون والعلماء يتولون في ازمان مختلفة من قبل الظلمة...وفي الباطن من قبل ائمة الحق. فتولاها بأمرهم فهو على الحقيقة وال من قبلهم ومتصرف بامرهم، ولهذا جائت الرواية الصحيحة بانه يجوز لمن هذه حاله ان يقيم الحدود ويقطع السراق ويفعل كل ما اقتضت الشريعة فعله من هذه الامور۔''

''مختلف اوقات میں علماء وصلحا، ظالم حاکم کی جانب سے سرکاری عہدہ قبول کرتے آئے ہیں درحقیقت یہ ائمہ حق کی جانب سے تھا۔ علما وصلحا ان (ائمہ حق) کے فرمان وحکم سے یہ کام کرتے تھے اور یہ یہ درحقیقت ائمہ حق کی جانب سے والی تھے اور ان کے حکم کے مطابق معاملات طے

کرتے تھے اسی لئے صحیح روایت میں آیا ہے کہ کسی فقیہ کی حالت یہ ہو تو وہ حدود کا نفاذ کرسکتا ہے چور کا ہاتھ کاٹ سکتا ہے چنانچہ مذکورہ امور کی انجام دہی کے سلسلے میں ہر وہ کام کر سکتا ہے جس کی شریعت تقاضا کرے۔" (متاہات۔ج۲/ص۲۲۹)

۳۔شیخ طوسیؒ (ولادت۳۸۵وفات۴۶۰)

" فاما اقامة الحدود فليس يجوز لاحد اقامتها إلا لسلطان الزمان المنصوب من قبل الله او من نصبه الامام لاقامتها واما الحكم بين الناس وقد فوضوا ذالك الى فقهاء شيعتهم فى حال لا يتمكنون فيه من توليه بنفوسهم، فمن تمكن من انفاذ حكم او اصلاح بين الناس و فصل بين المختلفين فليفعل ذالك وله الاجر والثواب ومن تولى ولاية من قبل ظالم فى اقامة حدود اور تنفيذ حكم فليعتقد انه متول لذالك من جهة سلطان الحق."

جناب شیخ طوسی کتاب "نہایۃ" کے باب "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" میں نفاذ حدود الٰہی کے بارے میں فقہائے شیعہ کی ذمہ داری (مع الامکان) کے متعلق مفصل طور پر تحریر کرتے ہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے:

"اجرائے حدود کوئی شخص نہیں کرسکتا سوائے حاکم وقت کے، جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے منصوب ومقرر کیا گیا ہے یا وہ افراد جن کو امام نے اسی غرض کے لئے نصب ومعین کر دیا ہو۔۔۔لیکن لوگوں کے درمیان فیصلہ وقضاوت کرنا۔۔۔بے شک شیعہ فقہاء کو سونپ دیا گیا ہے یہ اس صورت

میں ہے کہ جب ائمہ ہدیٰ بذات خود یہ کام انجام نہیں دے سکتے اگر کوئی فقیہ نفاذ احکام، اصلاحِ معاشرہ اور لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے نزاعات حل کرنے پر قدرت رکھتا ہو تو ایسا ضرور کرے اور باعث اجرو ثواب بھی ہے۔ اگر کوئی فقیہ اقامۃ الحدود (نفاذ) اور اجرائے احکامِ الٰہی کی خاطر کسی ظالم کی جانب سے عہدہ قبول کرے تو وہ یہ اعتقاد رکھے کہ وہ سلطان حق ''امام معصومؑ'' کی جانب سے ''تفویض شدہ'' ولایت کے مطابق کر رہا ہے۔'' (نہایۃ شیخ طوسی۔ ص ۳۰۰۔۳۰۲ طبع دوم سال ۱۹۸۰ بیروت)

۴۔ ابوحمزہ سلار دیلمیؒ (وفات ۴۴۸ھ)

'' اقامة الحدود .. فاما القتل ولجراح في الانكار فالى السلطان او من يامره السلطان ،فان تعذر الامر لمانع،فقدفوضوا (عليهم السلام)الى الفقهاء اقامة الحدود والاحكام بين الناس بعد ان لايتعدو اواحبا ولايتجاوز واحدا،وامروا اعامة الشيعة بمعاونة الفقهاء على ذالك.. ''

جناب ابوحمزہ سلار دیلمی اپنی کتاب ''المراسم'' باب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''حدود کا نفاذ۔۔۔۔اما انکار منکر کرتے ہوئے، کسی کو قتل کرنا یا مجروح کرنا، سلطان (حاکم اسلامی) سے مربوط ہے یا اس انسان سے مربوط ہے جس کو حاکم اسلامی حکم دے۔

اگر یہ کام کسی رکاوٹ کی وجہ سے ''ائمہ طاہرینؑ'' کے لئے ممکن نہ ہو، تو ائمہ

طاہرینؑ نے نفاذ حدود واجراء احکام، فقہاء کوتفویض کیا ہے جب تک وہ کسی واجب کونہ چھوڑیں اور حدود واحکام الٰہی سے تجاوز نہ کریں۔اور تمام شیعوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ مذکورہ بالا مقصد میں فقہاء کی معاونت کریں ۔'' (الجواہر ج ۱۲۔ص ۳۹۴)

۵۔ابن ادریس حلیؒ (وفات۔۵۹۸ھ)

''واما الحکم بین الناس والقضاء بین المختلفین فلا یجوز ایضاً الا لمن اذن له سلطان الحق فی ذٰلک ،وقد فوضوا ذٰلک الیٰ فقهاء شیعتهم المأمونین، الباحثین عن مأخذ الشریعة ''

ابن ادریس حلیؒ نے اپنی کتاب ''سرائر'' میں ''تنقید الاحکام'' کے عنوان سے ایک باب مدوّن کیا ہے۔جس میں نفاذ احکام کی شرائط بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

''اما ان لوگوں کے معاملات میں حکم کرنا اور اختلافی مسائل کا حل وفصل کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے مگر اس کے لئے جسے سلطانِ حق (اسلامی حاکم) کی جانب سے اجازت ملی ہو۔اور بے شک ائمہ اہل بیتؑ کی جانب سے مذکورہ بالا امور ،ان فقہاء کے سپرد کیا گیا ہے جو امین ،شرعی احکام کے مأخذ ومدارک کی تلاش میں پُر کار(ہوشیار)،فہیم اور خوب نظارت کرنے والے ہوں۔'' (متاہات۔ج۲۔ص ۲۸۵۔از سرائر)

۶۔محقق حلیؒ صاحبِ شرائع

''یجوز للفقهاء اقامة الحدود فی حال غیبة الامامؑ کما لهم الحکم بین الناس مع الامن من ضرر سلطان الوقت، ویجب

علی الناس مساعدتهم علی ذالک... "

''زمانِ غیبت امامؑ میں فقہاء عارفین حدود جاری کر سکتے ہیں چنانچہ ان کو لوگوں میں قضاوت وفیصلہ کرنے کا اختیار ہے جب تک حاکم وقت کی جانب سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو اور تمام لوگوں پر واجب ہے کہ مذکورہ بالا مقصد میں فقہا کی مساعدت کریں۔''

اس کے بعد جناب محقق نفاذ احکام وحدود کی شرائط یعنی فقیہ کی علمی، اجتہادی اور نفاذ کی بصیرت ومہارت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی شخص کو حدود کا نفاذ اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں مگر اس کے لئے جو احکام الٰہی سے آشنا ہو اس کے مدارک وماخذ سے آگاہ ہو اور شرع کے مطابق حدود کے نفاذ کی کیفیت وطور وطریقے کی معرفت کا حامل ہو۔'' (متاہات ج ۲۔ص ۲۸۵) شرائع الاسلام۔

۷۔علامہ حلیؒ

''والفقيه الجامع لشرائط الافتا وهي العدالة والمعرفة بالاحكام الشرعية وادلتها التفصيلية اقامتها، والحكم بين الناس بمذهب اهل الحق ويجب علی الناس مساعدتهم علی ذالک "

علامہ حلی کتاب ''ارشاد الاذہان باب امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' میں فقیہ جامع الشرائط کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فقیہ جامع الشرائط فتوی جو کہ عدالت اور احکام شرعیہ کو ادلہ تفصیلیہ

''کتاب، سنت، عقل واجماع'' سے استنباط کرنے کا علم رکھتا ہو، نفاذِ حدود

اورلوگوں میں مذہب اہل حق کے مطابق فیصلہ وحکم جاری کرسکتا ہے اور تمام لوگوں پراسکی معاونت کرنا ضروری ہے۔'' (متاہات ج ۲۔ص ۲۸۶)

''لان الفقيه المأمون منصوبون من قبل الامام ولهٰذا يمضى احكامه ويجب مساعدته على اقامة الحدود والقضاء بين الناس ..''

علامہ حلی کتاب مختلف میں ولایتِ فقیہ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''فقیہ امین، امامؑ کی جانب سے نصب اور مقرر کیا گیا ہے لہٰذا اس کا حکم وفیصلہ نافذ العمل ہے اور نفاذ حدود اور قضاوت کے بارے میں اس کی مساعدت کرنا واجب ہے۔'' (الجواہر ج ۱۱۔ص ۱۹۲ از مختلف)

۸۔ شہید اولؒ

'' والحدود والتعزيرات الى الامام و نائبه ولو عموماً فيجوز حال الغيبة للفقيه الموصوف بما ياتى فى القضاء اقامتها مع المكنة ويجب على العامة تقويته ومنع المتغلب عليه مع الامكان ويجب عليه الافتاء مع الامن وعلى العامة المصير اليه والترافع فى الاحكام ''

جناب شہید اول کتاب دروس کے کتاب حسبہ میں فقیہ جامع الشرائط کی مسئولیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''حدود وتعزیرات'' کا نفاذ'' امامؑ یا نائب امام سے مختص ہے اگر چہ نائب عام ہی کیوں نہ ہو، زمان غیبت میں فقیہ'' جس کی شرائط کا تذکرہ باب قضاوت میں آئے گا'' قدرت وامکان کی صورت میں حدود وتعزیرات

جاری کر سکتا ہے اور اس کو تقویت پہنچانا اور درصورتِ قدرت اس پر غلبہ حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے والوں سے مقابلہ کرنا فرض ہے۔ چنانچہ خوف وضرر کے فقدان کی صورت میں فتوی دنیا واجب ہے اور لوگوں پر اس کی طرف رجوع کرنا اور اپنے اختلافی معاملات میں اس سے فیصلہ کرانا ضروری ہے۔" (متاہات ج۲/۲۹۶)

صاحبِ کتاب "متاہات فی مدینۃ الضباب" مزید تحریر کرتے ہیں کہ "شہید ثانی کتاب مسالک کتاب امر بالمعروف، محقق ثانی (کرکی) جامع المقاصد کتاب امر بالمعروف میں مزید مذکورہ بالا نظریہ شہید اول کو اختیار کیا ہے چنانچہ باقی فقہاء شیعہ بھی کتاب امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں کم وبیش اسی نظریہ کو اختیار کرتے ہیں۔" (متاہات ج۲ص۲۸۶)

۹۔صاحب جواہرؒ

صاحب جواہرؒ، مندرجہ ذیل علماء، اسکافیؒ، شیخ مفیدؒ، شیخ طوسیؒ، سلار دیلمیؒ، فاضل علامہ حلیؒ، شہید اولؒ، شہید ثانیؒ، مقدادؒ، ابن فہدؒ، محقق کرکیؒ، سبزواریؒ، فیض کاشانیؒ اور دیگر کا نام لینے کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

"یجوز للفقهاء العارفين بالاحكام الشرعية عن ادلتها التفصيلية العدول، اقامة الحدود فی حال غيبة الامامؑ كمالهم الحكم بين الناس مع الامن من ضرر سلطان الوقت ويجب على الناس مساعدتهم علىٰ ذٰلک كما يجب مساعدة الامام عليه السلام عليه بل هو المشهور، بل لا

اجد فیہ خلافا الا ما یحکی عن ظاہر ابنی زھرۃ وادریس، ولم نتحققہ، بل لعل المتحقق خلافہ ...."

"فمن العجیب وسوسۃ بعض الناس فی ذلک، بل کأنہ ما ذاق من طعم الفقہ شیئا، ولا فھم من لحن قولھم ورموزھم امرا، ولا تأمل المراد من قولھم انی جعلتہ علیکم حاکما وقاضیا وحجۃ وخلیفۃ ونحو ذلک مما یظھر منہ نظم زمان الغیبۃ لشیعتھم فی کثیر من الامور الراجعۃ الیھم "(الجواہر ج ۲۱ ص ۳۹۷)

صاحب جواہر" ولایت فقیہ" کے متعلق اور اس کے قائل بہت سے علما کا نام لینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"زمانِ غیبتِ امامؑ میں عادل فقہاء جو احکامِ شرعیہ کو ان کے مدارک سے استنباط کرنے کی معرفت رکھتے ہیں، نفاذِ حدود کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سلطانِ وقت سے خوف وخطر لاحق نہ ہونے کی صورت میں، لوگوں کے درمیان قضاوت وفیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ اور لوگوں پر ان کی مساعدت کرنا لازم ہے جس طرح حدود وقضاوت کے معاملات میں ان پر امام معصومؑ کی مساعدت کرنا واجب تھا۔ (ولایتِ فقیہ کے بارے میں) یہی نظریہ (علمائے امامیہ کے پاس) مشہور ہے۔ بلکہ میں نے اس میں سوائے ابن زہرہؒ اور ابن ادریسؒ سے منسوب حکایت کے، کسی (فقیہ) کو مخالف نہیں پایا۔ اور یہ حکایت خود میرے نزدیک ثابت نہیں ہے بلکہ جو تحقیقات سے ثابت ہوا ہے وہ مذکورہ حکایت ونسبت کے خلاف ہے۔"

وضاحت

صاحبِ جواہرؒ کے کلام کے آخری حصے کا مطلب یہ ہے کہ نظریہ ولایتِ فقیہ کے بارے میں دیگر علما کے پاس یہی نظریہ مشہور ہے مگر جناب ابن زہرہؒ اور ابن ادریسؒ سے حکایت نقل کی گئی ہے کہ آپ دونوں اس نظریہ کے قائل نہیں ہیں۔ جنابِ صاحب جواہرؒ فرماتے ہیں کہ یہ نقل میرے پاس ثابت نہیں ہے بلکہ جو تحقیقات اور جستجو سے معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات بھی اس نظریئے کے قائل ہیں۔ (چنانچہ ابن ادریسؒ کا قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔)

جنابِ صاحبِ جواہرؒ ولایت فقیہ پر دلائل قائم کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

> "۔۔۔۔ولایتِ فقیہ کے متعلق بعض افراد کا وسوسہ عجیب وغریب ہے۔ گویا اس بعض نے فقہ کی لذت وطعم سے کچھ نہیں چکھا، اور ان (ائمہؑ) کے اندازِ کلام اور رموز واشارات کو کبھی نہیں سمجھا، اور نہ ان کے کلمات میں غور وتأمل کیا (جوانہوں نے ولایتِ فقیہ کے بارے میں فرمائے ہیں) کہ میں نے اس کو تم پر حاکم، قاضی، حجت اور خلیفہ قرار دیا۔ (اس قول) اور اس کے ہم معنی دیگر اقوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہؑ، زمانِ غیبت میں، شیعوں کے بہت سے معاملات میں نظم وضبط برقرار رکھنا چاہتے تھے۔" (الجواہر ج۔۲۱ص۳۹۴)

۱۰۔ شیخ الفقہاء شیخ انصاریؒ (وفات ۔۱۲۸۱ھ)

> "اما وجوب الرجوع الى الفقيه فى الامور المذكورة فيدل عليه مضافا الى مايستفاد من جعله حاكما كما فى مقبولة عمر بن حنظله الظاهرة فى كونه كسائر الحكام المنصوبة فى زمان النبىﷺ والصحابة فى الزام الناس بارجاع الامور المذكورة اليه بل المتبادر عرفاً من نصب السلطان

حاکما،وجوب الرجوع فی الامور العامة المطلوبة للسلطان الیه(ثم یذکر روایة "مجاری الامور... والتوقیع الشریفة" واما الحوادث الواقعة...) فان المراد بالحوادث ظاهرا مطلق الامور التی لابد من الرجوع فیها عرفاً او عقلاً او شرعاً الی رئیس..." (مکاسب۔۱۵۴)

جناب شیخ اعظم انصاریؒ مکاسب میں ولایت فقیہ کے مختلف ابعاد پر روشنی ڈالنے کے بعد روایت (مقبولہ حنظلہ) کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فقیہ کو بعنوان حاکم منصوب کرنا بالکل ان حکام کی طرح ہے جو زمان حضور اکرمؐ (اور حضرت امیر المومنینؑ) اور صحابہ کرام کے زمانے میں منصوب کئے جاتے تھے اور تمام لوگوں پر لازم تھا کہ اپنے تمام معاملات میں ان کی طرف رجوع کریں۔۔۔۔ بلکہ کسی سلطان کے کسی کو بعنوان حاکم نصب کرنے سے یہ معنی متبادر (جلد ذہن میں آنے والا) ہے کہ ان تمام معاملات میں اس حاکم "فقیہ" کی جانب رجوع کرنا ضروری ہے جو ان امور میں سلطان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ پھر شیخ اعظم روایت "مجاری الامور بید العلما" ("تمام امور و معاملات علما کے ذریعے جاری ہونا چاہئے۔" جو کہ امام حسینؑ سے تحف العقول وغیرہ میں مروی ہے) اور اس کے بعد امام زمانہؑ سے مروی توقیع شریف کا بھی بطور دلیل ذکر کیا ہے۔ توقیع کا ترجمہ: رونما ہونے والے حوادث و مسائل میں ہماری احادیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ تم لوگوں پر میری حجت ہیں اور میں ان پر خدا کی حجت ہوں۔ اس توقیع شریف میں آمدہ فقرہ (رونما ہونے والے حوادث و مسائل) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس سے مراد حسب الظواہر وہ تمام امور و معاملات ہیں جو عرف، عقل اور شرع کی نگاہ میں کسی رئیس کی طرف رجوع کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ شیخ اعظم انصاریؒ نے اپنی دوسری کتاب "القضاء" میں

امامؑ سے مربوط امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ امور خود امام سے مخصوص ہیں۔

۲۔ وہ امور جن میں امام، ولایت رکھتا ہے

پہلی قسم امام کے اپنے زمانے سے مربوط ہے لیکن دوسری قسم تمام زمانوں سے مربوط ہے اس کے بعد فقہاء کے نصب کئے جانے کو دوسری قسم میں شمار کرتے ہیں اور فقہاء کے ولایت کو غیبت کے زمانے میں ان کی حکومت کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔ (کتاب القضا والشہادات ص ۲۴۳۔۲۴۴ بحوالہ ولایت و دیانت ص ۹۰ ترجمہ اردو)

۱۱۔ سید بحر العلومؒ (وفات ۱۳۲۶ھ)

''۔۔۔اسلامی معاشرے اور تمام لوگوں کی ریاست و نگرانی امامؑ کے ذمے ہے اور یہی اس کا سبب ہے کہ لوگ اپنی مصلحتوں سے مربوط ہر مسئلے میں امامؑ سے رجوع کرتے ہیں جیسے معاد، معاش اور رفع ضرر و فساد، جس طرح ہر قوم ایسے مسائل میں اپنے سرپرستوں کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر، نظامِ اسلامی کے استحکام و دوام کا سبب بنے گا کہ اس کا تحقق ہمیشہ اسلام کے مقاصد میں سے تھا اس لئے اسلامی نظام کے تحفظ کے لئے امامؑ کو اپنا جانشین فقیہ جامع الشرائط کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا ہے اس کو بعض روایات جیسے ''پیش آنے والے واقعات میں ہماری احادیث کے راویوں (فقہاء) کی طرف رجوع کرو'' سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ بہت سے امور میں فقیہ کی طرف رجوع کرنے میں فقہاء اتفاق نظر ''رأیے'' رکھتے ہیں۔ (بلغۃ الفقیہ ج ۳

ص۲۲۱،۲۳۲ بحوالہ ولایت فقیہ ودیانت ص۱۹۱ اردو)

۱۲۔الشیخ محمد رضا المظفرؒ

" عقیدتنا فی المجتهد الجامع للشرائط انه نائب الامامؑ فی حال الغیبة وهو الحاکم والرئیس المطلق له ما للامام فی الفصل فی القضایا والحکومة بین الناس .فلیس المجتهد الجامع للشرائط مرجعا فی الفتیا فقط بل له الولایة العامة،وهذه المنزلة او الریاسة العامة اعطاها الامامؑ للمجتهد الجامع للشرائط لیکون نائبا عنه فی حال الغیبة . .لذالک یسمی نائب الامام "

جناب شیخ مظفر مجتہد جامع الشرائط کے بارے میں شیعہ عقیدہ بیان کرتے ہوئے اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"مجتہد جامع الشرائط کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ زمان غیبت میں نائب امام ہے اور وہی حاکم اور رئیس مطلق ہے لوگوں کے معاملات اور ان کے درمیان قضاوت وفیصلہ کرنے کے حوالے سے مجتہد کو وہی مقام حاصل ہے جو امام (معصوم) کو حاصل ہے لہٰذا مجتہد جامع الشرائط صرف فتوی دینے میں مرجع نہیں ہے بلکہ اس کو ولایت عامہ ومطلقہ حاصل ہے۔ یہ مقام ومرتبہ اور ریاست عامہ ومطلقہ امامؑ نے مجتہد جامع الشرائط کو عطا کیا ہے تا کہ زمان غیبت میں امام کی نیابت کر سکے اسی لئے مجتہد جامع الشرائط کو نائب امام کہا جاتا ہے۔(عقائد امامیہ)

۱۳۔ حضرت امام خمینیؒ

عصرِ حاضر میں نظریہ ولایت فقیہ کے بانی مبانی اور بطل اسلام حضرت امام خمینی قدس سرہ کے دروس سے چند سطور پیش خدمت ہیں۔

''ولایت فقیہ کا موضوع کوئی نئی چیز نہیں ہے کہ اسے ہم لائے ہوں، بلکہ یہ مسئلہ ابتدائے اسلام سے ہی مورد بحث تھا۔ تمبا کو کی تحریک کے بارے میں میرزائے شیرازیؒ کا حکم چونکہ حکم حکومتی تھا۔ لہٰذا دوسرے فقہاء پر بھی واجب الاتباع تھا۔۔۔ یہ کوئی قضاوتی حکم نہ تھا کہ چند لوگوں کے درمیان کسی موضوع پر اختلاف ہوا ہو، مرحوم میرزا محمد تقی شیرازی نے جو ''انگریز کے خلاف'' جہاد کا حکم دیا۔ البتہ اس کا نام دفاع تھا اور تمام علما نے اس کی اطاعت کی، اس لئے کہ وہ حکومتی حکم تھا جیسا کہ نقل کیا گیا ہے مرحوم کاشف الغطاء نے بھی بہت سے ایسے مطالب بیان کئے ہیں، متاخرین میں سے مرحوم نراقی، رسول اللہؐ کے تمام اختیارات کو فقہاء کے لئے ثابت جانتے ہیں۔ آقائے نائینیؒ بھی فرماتے ہیں ''یہ مطلب عمر ابن حنظلہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے'' بہر حال یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے ہم نے صرف اس موضوع پر بیشتر تحقیق کی ہے اور حکومت کے مختلف شعبوں کا ذکر کر کے حضرات کی خدمت میں پیش کیا ہے تاکہ مسئلہ مزید واضح ہو۔۔۔'' (ولایت فقیہ امام، بحوالہ ولایت ودیانت ص ۹۶)

۱۴۔ مقام معظم رہبری آیت اللہ سید علی خامنہ ای دام ظلہ:

ولایت وحکومت فقیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''عادل'' ''ولی فقیہ'' کی حکومت دیگر حکومتوں کی نسبت کامل ترین حکومت ہے، عادل ولی فقیہ وہ ہے جو اسلام شناس اور لوگوں پر حکومت کرنے کے

طور وطریقوں سے کما حقہ واقف ہے۔'' (کتاب نقد شمارہ ۴ سال اول ص ۲۰۰)

۱۵۔شیخ جعفر سبحانی

حقوقِ حاکم اسلامی (مجتہد جامع الشرائط) کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ

''اسلامی نظام تمام مسائل ومشکلات کے حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ ''اسلام میں'' حاکم اسلامی ''فقیہ جامع الشرائط'' کو وہ تمام اختیارات دیئے گئے ہیں جو کہ امت اسلامیہ کی مصلحت کے مطابق استعمال کر سکتا ہے اور حاکم اسلامی ''فقیہ جامع الشرائط'' کو وہ پوری صلاحیت حاصل ہے جو نبیؐ اور امامؑ کو حاصل تھی البتہ نبیؐ اور امامؑ سے مخصوص صلاحیت، حاکم اسلامی کو حاصل نہیں ہے۔(الالٰہیات ج ۳ ص ۵۲۵)

۱۶۔آقائے نائینیؒ

''حاکم اسلامی ''جامع الشرائط'' کو یہ اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ مجتمع اور معاشرہ کی مصلحت اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اسلامی قانون کے اندر رہتے ہوئے ہر مناسب قانون وحکم صادر کر سکتا ہے۔(تنبیہ الامۃ وتنزیہ الملۃ ص ۹۷ بحوالہ الالٰہیات ج ۳ ص ۵۲۶)

(مزید اضافہ)

ولایتِ فقیہ اور
اقوال فقہاء کے مشترکہ نقاط

فقہائے عظام کے کلمات واقوال سے مندرجہ ذیل مشترکہ نقاط قابل غور ہیں:

پہلا نقطہ:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حدود کا نفاذ، نزاعات میں فیصلہ اور دوسرے اسلامی قوانین کا اجراء اسلامی معاشرہ اور افراد کی زندگی کے معاملات (امور سیاست اور انتظامی امور) اولاً وبالذات ائمہ اہل بیتؑ سے مختص ہیں۔ اور ائمہ ہدیٰؑ مذکورہ بالا امور کی انجام دہی کے شرعی حق دار اور صاحبِ استحقاق ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کی رضایت کے بغیر مذکورہ امور میں دخل اندازی کرے بصورت دیگر غاصب تصور کیا جائے گا۔

دوسرا نقطہ:

زمانِ حضورِ معصومینؑ میں مذکورہ بالا امور وہ امراء اور حکام انجام دے سکتے ہیں جو ان کی طرف سے اس کام کے لئے مقرر و منصوب کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر المومنینؑ کے عہدِ خلافت میں شہروں اور دیگر علاقوں کا گورنر و نمائندہ مقرر کئے جاتے تھے اور یہ افراد "گورنر" اپنے ماتحت علاقہ یا شہر کے معاملات چلاتے تھے چنانچہ تمام لوگوں پر واجب تھا کہ ان گورنروں کے ساتھ تعاون کریں اور ان کی معاونت واطاعت سے گریز نہ کریں۔ جیسے مالک اشترؒ، محمدؒ بن ابی بکر، عثمان ابن حنیفؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ ان امراء اور حکام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ امامِ معصومؑ کی جانب سے براہِ راست ایک فرمان کے ذریعے نصب کئے گئے تھے یعنی ان کو

ولایت وحکومت، نصبِ خاص کے ذریعے حاصل تھی۔

تیسرا نقطہ:

فقہائے عظام کے اقوال وکلمات میں یہ نقطہ بھی صراحت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ امام معصومؑ اور امام کے نائب خاص کی عدم موجودگی میں حدود کا نفاذ، قضاوت اور مسلمانوں کے امور چلانے کی ذمہ داری شیعہ فقہاء پر ڈالی گئی ہے کیونکہ فقہائے جامع الشرائط، امامؑ کے نائب ہیں۔ اور اس سلسلے میں ان کو وہی ولایت وسرپرستی کا حق حاصل ہے جو امامؑ کو حاصل تھی۔

چوتھا نقطہ:

ان کے کلام میں یہ شرائط بھی پائی جاتی ہیں کہ حدود کے نفاذ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ کے لئے جامع الشرائط فقیہ کے پاس قدرت وامکان موجود ہو۔ اور حاکمِ وقت کی جانب سے خوف وضرر نہ ہو۔ بصورتِ دیگر شرعی تکلیف ساقط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہاء کے اقوال وکلمات اور بحث کا محور یہ نقطہ ہے کہ اسلامی مملکت پر جائر وظالم حکومت قائم ہے اور اس حالت میں قدرت حاصل کرنے کی چند صورتیں متصور ہیں:

الف: ظالم حکومت کا حصہ بن کر سرکاری عہدہ پر فائز ہونا، مثلاً قاضی، گورنر یا وزارت کے مناصب قبول کرنا۔ چنانچہ عبداللہ نجاشی کو حضرت امام جعفر صادقؑ کے دور میں خلیفہ عباسی کی جانب سے ''اہواز'' کا گورنر بنایا گیا تھا۔ اور علی ابن یقطین ہارون رشید کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر فائز تھا۔

ب: حکومتِ وقت کی نگاہ سے مخفیانہ طور پر مرکز سے دور دراز علاقہ پر مستقل انداز میں احکامِ الٰہی جاری کرسکے۔ (یہ ایک مفروضہ ہے۔)

ج: جامع الشرائط فقیہ ظالم حکومت کا تختہ الٹ دینے کے بعد مستقل حکومت قائم کرے اور کسی ظالم حکومت کے خوف وہراس کے بغیر، حدود واحکامِ الٰہی کے نفاذ اور امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کے فریضے پر عمل کرنے پر قادر ہو۔ چنانچہ حضرت امام خمینیؒ نے ایران میں ایسی قدرت حاصل کی۔

(خلاصہ: ان تمام صورتوں میں اسلامی حدود و نظامِ قضاوت وغیرہ کا اجراء فقیہ جامع الشرائط پر لازم ہے۔)

پانچواں نقطہ:

قابلِ غور بات یہ ہے کہ حکومتِ جائر کا عہدہ قبول کرنا کبھی جبر و اکراہ کی شکل میں ہے اور کبھی اختیاری۔ چنانچہ اگر جائر کی طرف سے کسی فقیہ کو سرکاری عہدہ (قضاوت وغیرہ) کی پیشکش کی جائے اور اس کو یہ معلوم ہو کہ اس عہدہ کے ذریعے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور نفاذِ حدود و تعزیرات کے مواقع ضرور میسر آتے ہیں۔ اس وقت یہ عہدہ قبول کرنا واجب کفائی ہے اور کبھی عینی؟ دونوں صورتوں (کفائی اور عینی) میں فقہاء کے کلام میں یہ نقطہ موجود تھا کہ فقیہ جامع الشرائط اپنے آپ کو امام معصومؑ (سلطان الحق، سلطان الاسلام) کا تفویضی نمائندہ تصور کرے۔ یعنی میں امام زمانؑ کا نائبِ عام ہوں نہ کہ ظالم حاکم کا منصوب شدہ قاضی یا والی۔

فقیہ جامع الشرائط اس عہدے پر قائم ہوتے ہوئے جو فیصلے یا اجراءِ احکام کے متعلق احکامات و فرامین جاری کرتا ہے وہ سب دراصل امامِ حق کے حکم اور امر کے مطابق جاری کرتا ہے۔ یعنی فقیہ اس وقت ظاہراً حاکمِ جور کی جانب سے والی یا قاضی (شریکِ حکم) نظر آتا ہے لیکن درحقیقت، حاکمِ اسلامی (امام زمانہؑ) کی جانب سے والی یا قاضی اور صاحبِ ولایت ہے۔

چھٹا نقطہ: اسلامی نصوص اور فقہ اسلامی میں ظالم کی جانب سے ولایت قبول کرنا حرام اور اس سے کسب و کار، کمائی اور اجرت لینے سے سخت منع کیا گیا ہے۔ جناب شیخ انصاریؒ نے مکاسبِ محرمہ میں اس مطلب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حضرت امام خمینیؒ نے تحریر الوسیلہ میں اور دیگر علماء نے اپنی اپنی کتب میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ تمام علماء کے نزدیک ''ولایتِ حاکم جور'' بالاتفاق حرام ہے۔

مگر بطور استثنیٰ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اسلامی نظام کے ایک جزو کے نافذ ہونے کو (اگر چہ ظالم حاکم کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو) اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اس کام کیلئے اسلام نے اس ظالم کے ساتھ تعاون کرنے اور اس کی جانب سے ولایت قبول کرنے کو حلال کر دیا ہے۔ ''تقدیم اہم بر مہم'' اور نفاذ حدود وقضاوت کی مصلحت کو اس مفسدہ پر جو ولایتِ جائر کو قبول کرنے میں ہے، ترجیح دی ہے۔

ساتواں نقطہ:

فقہائے عظام کے اقوال میں یہ نقطہ بھی بالکل عیاں نظر آ رہا ہے کہ تمام شیعوں کی یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ اس فقیہ جامع الشرائط کی معاونت ومساعدت کریں جو ظالم حکومت کا ایک حصہ بن کر (شریکِ حکم) اسلامی نظام کا ایک حصہ نافذ کر رہا ہے۔

آٹھواں نقطہ:

پانچویں نقطے میں یہ ذکر ہوا تھا کہ فقیہ جامع الشرائط حاکمِ ظالم کی جانب سے عہدہ قبول کرنے کی صورت میں بھی در حقیقت امام برحق کا نمائندہ ہے۔ اور امام زمانؑ کی جانب سے اسے ولایت حاصل ہے۔

اب یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ اگر فقیہ جامع الشرائط، کسی ظالم کا سہارا لئے بغیر یعنی ظالم حکومت کا حصہ بنے بغیر، عوام الناس اور خواص الامت کی طاقت سے مستقل اسلامی حکومت تشکیل دینے اور جداگانہ حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے اور اسلامی نظام، اسلامی اصول وقواعد کے تحت نافذ کرنے کی قدرت وطاقت حاصل کر سکے تو امام زمانہؑ کی جانب سے ولایت ونمائندگی کے ثبوت میں کسی شک وتردید کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ ایک انصاف پسند شخص جو اسلام شناس، مبانیِ فقہی اور فقہِ سیاسیٔ اسلام کے بارے میں ابتدائی معرفت کا حامل ہو وہ ''ولایتِ فقیہ'' کو ایک بدیہی نظریہ سمجھے گا اور کسی دلیل وبرہان کی

ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔

چنانچہ امام خمینیؒ نے نجف اشرف میں ولایت فقیہ کے موضوع پر درس کے دوران فرمایا تھا کہ "ولایت فقیہ کا تصور اس کی تصدیق کے لئے کافی ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ولایت فقیہ کی حقیقت، ماہیت، حدود وقیود، فوائد اور اس کے انکار کے نقصانات کا حقیقی معنوں میں درک کرنا، اس پر یقین اور تصدیق کرنے کا ضرور باعث بنے گا چنانچہ ضمیمہ "انکار کے اسباب" کا ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

بہر حال ایک منصف شخص "مذکورہ معلومات کا مالک" فحوی اور اولویت سے ضرور استدلال کرے گا کہ فقیہ جامع الشرائط، حاکم ظالم سے الگ اور جداگانہ نظام قائم کرنے کی صورت میں امام کی جانب سے نیابت اور ولایت کے منصب پر قطعاً فائز ہے اور عوام الناس وخواص امت پر اس کی معاونت کرنا بلاشبہ لازم ہوگی اس کے بعد کوئی شک وتردید کرے تو مرحوم صاحب جواہر کے کلام کے مطابق تو صرف وسوسہ ہی وسوسہ ہے اور لحن وانداز ائمہ اور ان کے کلمات وتعلیمات میں پائے جانے والے رموز وفلسفہ واسرار سے ہرگز آگاہ نہیں چنانچہ مذہب تشیع کے اساطین و فحول علما کے نظریہ وموافق کے ادراک سے عاجز ہے۔

سابقہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر فقہائے امامیہ زمانِ غیبت میں اسلامی حکومت کی تشکیل یعنی حدود وتعزیرات کے نفاذ اور اسلامی نظام قضاوت کو مع القدرۃ وامکان ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک فقیہ جامع الشرائط کے توسط سے اجرائے احکام ونفاذ شریعت کو بوجہ نیابت امامؑ درست تصور کرتے ہیں یہ کام ایک ظالم حاکم کے ساتھ انجام دینا پڑے یا بطور مستقل وجداگانہ اپنا تشخص قائم کرنے اور اسلامی حکومت تشکیل دینے میں کامیابی حاصل کر سکے۔ دونوں صورتوں میں ہدف وغایت اسلامی نظام کا نفاذ ہے جو ایک عالم عارف وفقیہ جامع الشرائط کے توسط سے، امام معصوم یعنی امام زمانہؑ کی نیابت کرتے ہوئے "ولایت فقیہ" کا اجرا کرتا ہے اس کا دوسرا نام نظریہ ولایتِ فقیہ ہے۔

(مزید اضافہ)

ولایتِ فقیہ اور فقہاء کا عملی دور

ولایت فقیہ کے بارے میں اصل کتاب میں ہم تین نظریے بیان کر چکے ہیں تیسرا نظریہ ''ولایت مطلقہ'' کے علاوہ باقی پہلا اور دوسرا نظریہ حضرت امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ کے زمانے سے لیکر زمان غیبت صغریٰ پھر غیبتِ کبریٰ اور عصر حاضر تک جاری وساری ہے۔ مذکورہ تمام اعصار میں بحکم امام زمانہؑ بالخصوص اور ائمہ اہل بیتؑ بالعموم، شیعیانِ اہل البیتؑ اپنے مذہبی، حقوقی، سیاسی، تعلیمی اور عدلیہ وغیرہ سے مربوط مسائل میں علماء وفقہاء کی طرف رجوع کرتے آئے ہیں اور تا بحال یہ سلسلہ جاری ہے اور جتنا ممکن تھا اپنے مسائل وزندگی کے معاملات میں پیش آنے والے مشکلات کا حل تعلیمات ائمہؑ کے مطابق اپنے اپنے زمانے کے مراجع سے دریافت کرتے تھے۔

حلال وحرام، واجب ومکروہ، نجاست وطہارت، عبادت ومعاملات کے مسائل سے لے کر سیاست، ظالم حکومت کے ساتھ تعاون کرنا یا نہ کرنا، اس کی جانب سے ولایت وعہدے قبول کرنا یا نہ کرنا، حکومت وقت سے جائزہ، ہدیہ اور عطیہ وصول کرنے کا جواز وعدم جواز، اس کے ساتھ جمعہ اور عیدین میں شرکت یا عدم شرکت اور حکومت کا مقرر کردہ قاضی سے فیصلہ کرانے کے لئے رجوع کے مسائل تک فقہاء وعلما سے ہمیشہ مع القدرة و امکان رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں عملاً ''حکومت در حکومت'' کی مثال قائم کی گئی تھی۔ یعنی ''ولایت فقیہ'' اگرچہ محدود پیمانہ پر کیوں نہ ہو عملاً طول تاریخ میں نافذ وساری تھی اور تا بحال بدستور جاری ہے

اما یہ سوال کہ ولایت مطلقہ کیوں ساری وجاری نہیں تھی؟ اس کا جواب اور اس کے

اسباب وعلل، تاریخ کا سرسری مطالعہ کرنے سے عیاں ہو جائے گا کہ یہ مسئلہ ایک تاریخی مسلمہ حقیقت ہے کہ کبھی سیاسی دباؤ، حالات کی شدت، حکام وقت کی وحشیانہ سلوک اور شیعوں کے خلاف انسانیت سوز مظالم کے ارتکاب سے شیعوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھار حکام وقت کے مزاج میں تبدیلی آنے سے شیعوں کے ساتھ ان کے موقف میں لچک اور ظلم وستم وبربریت میں کمی بھی آجاتی تھی اس وقت شیعہ فقہاء اور شیعوں کے درمیان طبیعی رابطہ برقرار ہوتا تھا اس وقت فقہائے امامیہ کی مرجعیت، ولایت فقیہ (حکومت در حکومت) کا دائرہ وسیع اور رعایا کے معاملات کے بارے میں ''فقیہ'' کی گرفت مضبوط ہوا کرتی تھی۔

چنانچہ خلفائے بنی عباس کے اواخر میں خلیفہ، نام کی حد تک رہ گیا تھا اور حکومت کے سیاسی معاملات اور انتظامی امور، شیعہ حکام کے پاس تھے یعنی خاندان بویہئیین زمامِ امور مملکت پر قابض تھا۔ اس دور میں شیعوں کو ایک نسبی آزادی مل گئی اس دور میں شیعہ فقہاء نے دینی علوم کی ترویج، مسائل کی تبیین، دین کی تبلیغ اور مذہب کے نظریاتی حدود کا دفاع کرنے کے لئے اپنی مرجعیت وولایت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ عہدِ شیخ مفیدؒ، سید مرتضیٰؒ اور شیخ طوسیؒ کی مرجعیت کے اوائل اس مدعا کے گواہ ہیں۔ چنانچہ نجف اشرف کے بعد جب حلہ ''عراق'' حوزہ علمیہ بن گیا تو مذکور خصوصیت بھی وسیع پیمانہ پر نظر آتی ہے۔ اس بات کا تکرار بے جا نہ ہوگا کہ ان تمام اوقات میں فقہائے عظام حاکم مطلق تو نہ تھے اور نہ حکومت وقت کا شریک حکم، مگر اپنے مسلکی حلقے پر ایک خاص نوعیت کی حکومت وولایت رکھتے تھے۔

شیعہ حکومتوں میں فقہاء کا دور

یہ بھی ایک حقیقت کے طور پر صفحہ تاریخ اسلامی پر ثبت ہے کہ بعض علاقوں اور شہروں پر حکامِ شیعہ بطور مستقل حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے تھے اور ایران کے صفوی عہد سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اور بعض فقہائے شیعہ نظریہ ولایت فقیہ کے مطابق بعض حکومتی مناصب ''شیخ

الاسلام'' پر فائز تھے۔[1]

چنانچہ بعض دیگر فقہاء نے بعض حکام کو حکومت چلانے کے شرعی اجازت نامے بھی صادر کئے تھے چنانچہ شیخ جعفر کبیر صاحب کشف الغطا مقیم نجف اشرف فتح علی خان قاجار کو اجازت دینے والے علماء میں سے ایک تھا۔ جناب میرزا شیرازی کبیر مقیم سامرا ''عراق'' نے حرمت تمباکو کا فتویٰ حاکمیت دے کر ایک حاکم مطلق کا کام سرانجام دیا تھا اور اسی حکم کے صادر ہونے کے بعد ایران کے گوشہ گوشہ میں اس کا نفاذ ہوا حتیٰ شاہ ایران کے اندرون کاخ اور حکومتی محل تک ہلا کر رکھ دیا اور انگلستان کی کمپنی کو ایران کے اقتصادی معاملات پر قبضہ جمانے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ باقی تمام فتووں کی طرح نہ تھا یہ سیاسی، اقتصادی، مذہبی فتویٰ تھا جو مملکتِ ایران کو اغیار کے تسلط سے تحفظ فراہم کرنے کے لئے فقیہ جامع الشرائط میرزا شیرازی نے دیا اور پوری دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ ملک وقوم اور آزادی واستقلال کے تحفظ فراہم کرنے کے شرعی اختیارات (ولایت وحکومت) امام زمانہ کے نائب کے پاس ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ فتویٰ کچھ اس طرح تھا ''تمباکو نوشی در این زمان مبارزہ با امام زمانؑ است۔''

حکومتِ فقہاء کی ایک تصویر

عہدِ حاضر کی اصطلاح اور موجودہ حکومتوں کی شکل وصورت کے مطابق سابقہ ازمان میں کسی فقیہ کے پاس کوئی حکومت نہیں تھی، مگر حکومت کی ذمہ داری اور اس کی تشکیل کے بنیادی اصول اور بنیادی ستون کو مدنظر رکھنے سے یہ ناقابلِ انکار حقیقت، تاریخ تشیع میں نظر آتی ہے کہ شیعہ فقہاء اپنے اپنے حلقہء اثر اور مذہب ومسلک کے مطابق ایک حاکم کی طرح حکومت کے بنیادی ستون اور ذمہ داریاں ان کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ یعنی دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق مندرجہ ذیل امور ومعاملات فقہاء عظام سرانجام دیتے تھے۔

[1] شیخ بہائی اور ان کے والد گرامی شیخ عبدالصمد اور محقق کرکی ''محقق ثانی'' وغیرہ مذکورہ بالا منصب پر فائز تھے۔

ا۔عدلیہ:

لوگوں کے درمیان مختلف موضوعات سے متعلق پیدا ہونے والے اختلافات اور منازعات کا فیصلہ۔

۲۔وزارتِ دفاع:

بوقتِ ضرورت مسلمانوں کی جان ومال وملک کے تحفظ کے لئے کفار کے خلاف جہاد کا حکم دینا، بلکہ علمائے امامیہ بذات خود جہاد میں شریک ہوتے تھے اور مجاہدین کی قیادت بھی کرتے تھے چنانچہ 1920ء میں عراق میں برطانیہ کے خلاف عراقی مجاہدین کو لے کر میدانِ جنگ وقتال میں کاظمین، کربلا اور نجف کے علما نکلے، ایران میں بھی اس قسم کے واقعات رونما ہوئے۔ اپنے زمانے کے مرجع میرزا شیرازی کبیرؒ کا حرمتِ تمبا کو کا فتوی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

۳۔وزارتِ داخلہ: ملک میں امن عامہ برقرار رکھنے کا فتوی۔

۴۔قوتِ مقنّنہ: بیان احکام اور اسلامی قانون کی تشریح اور توجیہ وبیان۔

۵۔وزارتِ نشریات: اسلام کی تبلیغ ونشر واشاعت۔

۶۔وزارتِ تعلیم: اسلامی علوم کی تدریس وفروغ اور اسلامی ثقافت کی نشر واشاعت۔

۷۔وزارتِ اوقاف ومالیہ: حقوق شرعیہ اور دیگر اموال مسلمین وموقوفات کی نگہداری اور تقسیم۔

(مزید اضافہ)

ولایتِ فقیہ سے انکار کے اسباب

ولایتِ فقیہ کا کسی فقیہ نے انکار مطلق نہیں کیا اگر اختلاف ہے تو اس کے دائرہ وحدود کے بارے میں پایا جاتا ہے کہ اس ولایت کا دائرہ محدود ہے یا وسیع ''مطلقہ''۔ البتہ بعض اہل قلم کے پاس انکار ولایت کی وجہ تشیع سے دشمنی اور اسلام سے مخالفت ہے چنانچہ بعض دیگر اس لئے مخالفت پر تلے ہوئے ہیں کہ ان کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ فی الحال ہم ان وجوہات کا تذکرہ کرتے ہیں جو ''منکرینِ ولایت مطلقہ'' میں مجموعی طور پر پائی جاتی ہیں۔

پہلا سبب: ''ولایت کے متعلق اسلوب بحث میں خلط''

ایک بنیادی سبب ولایتِ فقیہ کے بارے میں وہ غیر موزوں اندازِ بحث ہے جو کتبِ فقہ میں نظر آتا ہے اور اسی اسلوبِ بحث پر نتائج بھی مرتب کئے جاتے ہیں۔ درحالیکہ اگر بحث کرنے کی کیفیت اور مسئلہ ولایت، طرح کرنے کا انداز بدل جائے تو عین ممکن ہے کہ نتائج بدل جائیں گے اور نظریہ ولایتِ فقیہ کو سمجھنے، اس کی حقیقت کے ادراک اور ضرورت کے احساس کے حصول میں مدومعاون ثابت ہوگا۔ یعنی ولایت کی بحث خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ اگر موضوعِ بحث بالکل واضح کیا گیا ہوتا تو نتیجہ بھی اسی کے مطابق آجاتا۔ میں یہاں پر اس قسم کی بحث کے چند نمونے پیش کرتا ہوں تاکہ قاریٔ محترم خود فیصلہ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ کرے۔

الف: اصل عدم الولایۃ

میرے خیال میں ولایت فقیہ سے مربوط اندازِ بحث (جو مکاسب وغیرہ میں ہے) خلط

مبحث کا ایک نمونہ ہے وہ یہ ہے (اصالۃ عدم ولایۃ احد علی احد) ''کسی شخص کو کسی شخص پر ولایت و سرپرستی نہیں'' ولایت فقیہ کے بارے میں مذکورہ ''اصل'' کو جاری کرنا زیادہ فنی اور دقیق نہیں ہے کیونکہ اس اصل کے مطابق کسی بھی فرد کے بارے میں ثبوتِ ولایت یا عدمِ ثبوتِ ولایت، موردِ شک ہو تو ''اصل عدم ولایۃ'' جاری ہوگا۔ فقیہ کے بارے میں بھی یہی ہوگا کہ ''اصل عدم ولایت فقیہ'' ہے اور اثبات ''ولایت فقیہ'' خلاف اصل ہے۔ چنانچہ ولایت فقیہ کی کسی دلیل کی دلیلیت میں بحث کرتے وقت یہی کہا جاتا ہے کہ اصل عدم ولایت ہے۔ چنانچہ اصل عدم ولایت سے استدلال کرنے کا تذکرہ صاحب جواہر نے بعض دیگر فقہاء سے نقل کیا ہے۔ جواب: مذکورہ بالا اصل ''عدم الولایۃ'' دو طریقوں سے مخدوش ہے۔

پہلا طریقہ: اصالۃ الولایۃ

ولایت فقیہ کی نفی کے لئے ''اصالۃ العدم'' جاری کرنا قطعاً درست نہیں ہے کیونکہ یہاں ''اصالۃ العدم'' نامی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ''اصالۃ الولایۃ'' جاری ہوگی۔

وضاحت:

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت وقیادت کے لئے تخلیق حضرت آدم سے پہلے بھی ولایت وسرپرستی کے بنیادی مسئلہ کے بارے میں اعلان فرمایا:

''انی جاعل فی الارض خلیفه''

بنی نوعِ انسان کی تخلیق سے پہلے اس کے خلیفہ سرپرست اور صاحب ولایت کے بنانے کا اعلان انسان کی ضرورت کے مطابق کیا گیا ہے اور کوئی فرد یا معاشرہ الٰہی قیادت سے جدا ہو کر اپنی معنوی، سیاسی، اخلاقی ومادی زندگی بہتر طریقے سے نہیں چلا سکتا لہٰذا انسان کی یہ ضرورت ''مجبوری'' ہر وقت، ہر خطے اور ہر سطح پر لازم لاینفک ہے۔ یعنی جب تک انسان، انسان ہے وہ کسی کی ولایت کا محتاج رہتا ہے اور یہ احتیاج ونیازمندی اس کے وجود کی گہرائیوں سے نکلنے والی آواز

ہے ۔لہٰذا سوال کا یہ انداز ہوگا کہ آیا زمانِ غیبت میں بنی نوعِ انسان کے لئے کسی قیادت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

جواب: یہ ہے کہ اصل لزوم وثبوتِ قیادت وولایت ہے۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ ''ولایتِ معصوم'' یعنی ''ولایتِ امام زمانہ'' ہماری رسائی سے باہر ہے۔لہٰذا ایک متبادل قیادت کی ضرورت اپنی جگہ باقی ہے۔اسی ضرورت کے تحت ائمہ معصومینؑ نے زمانِ غیبت میں، علمائے عارفین اور فقہائے ربانیین کی ولایت سے متمسک ہونے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ امام زمانہؑ فرماتے ہیں: فانهم حجتی علیکم و انا حجة الله [1]

دوسرا طریقہ: اصالۃ العدم

عام انسان کے بارے میں ''اصالۃ العدم'' درست ہے۔کیونکہ کسی عام انسان کی دوسرے تمام انسانوں پر ولایت وحکومت، نہ اصلی ہے نہ ثابت۔ یہاں سابق الذکر اصل درست ہے یعنی کسی شخص کو کسی دوسرے پر ولایت وسرپرستی حاصل نہیں ہے۔

لیکن فقیہ جامع الشرائط کا مسئلہ عام انسان سے قطعاً مختلف ہے ۔کیونکہ فقیہ جامع الشرائط کی ولایت بحیثیتِ نائبِ امام ثابت وحاصل ہے۔اختلاف، اس کی وسعت (ولایت مطلقہ) یا محدود ہونے میں ہے۔پس اصل ثبوت الولایہ ہے چنانچہ اصل در نیابت، عموم وشمول اور اطلاق ہے۔جیسا کہ اصول الفقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ کسی دلیل کے اطلاق اور تقیید میں شک ہو تو اصل عدم التقیید ہے۔

ایک اور شبہ:

ولایت تکوینی وولایت تشریعی میں خلط

بعض اہلِ قلم نے ولایتِ تکوینی کے بارے میں ایک تفصیلی بحث کرنے کے بعد اس طرح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ائمہ معصومینؑ کے لئے ولایتِ تکوینی ثابت ہے اور فقہاء کیلئے یہ ولایت

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں صفحہ 97۔حدیث چہارم

ہر گز ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا نظریہ ''ولایتِ فقیہ'' نا درست ہے۔

شبہ کا ازالہ:

ائمہ اہل بیتؑ کے لئے (ولایتِ تکوینی، ولایت تشریعی) دونوں ثابت ہیں۔ ولایت تکوینی ان کی خصوصیات میں سے ایک ہے اور نیابت بردار نہیں ہے، یعنی کوئی شخص ولایتِ تکوینی میں نیابت کرتے ہوئے امورِ تکوینی میں تصرف نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ولایتِ تشریعی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ائمہ معصومینؑ کو دی گئی ہے تا کہ معاشرہ اور فرد کے معاملاتِ زندگی منظم طریقے سے چلے اور نظامِ الٰہی کا نفاذ ہو سکے۔ اس کے علاوہ دیگر فوائد بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ولایتِ فقیہ سے مراد یہی ولایتِ تشریعی ہے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں کئی جگہ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اشکال:

بعض افراد نے اس طرح اشکال کیا ہے کہ ائمہؑ کی ذاتی صفات جیسے عصمت، بلند مقاماتِ معنوی اور قربِ الٰہی کے منازل تک کوئی رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا فقیہ کس طرح ان کی نیابت و ولایت کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

جواب: اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ کوئی فرد (فقیہ ہو یا غیر فقیہ) ائمہ ہدیٰؑ کے معنوی مقامات اور عصمت و علوم لدنی کا دعویٰ نہیں کرتا۔ ولایتِ فقیہ کا مطلب شرعی ذمہ داری انجام دینے کے لئے، ائمہؑ کی ولایت و نیابت کے عنوان سے، جواز حاصل کرنا ہے۔

یہ اعتراض کرنے والے دراصل ایک تاریخی حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں یا غفلت سے دوچار ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرمؐ نے مدینہ میں اسلامی حکومت تشکیل دی اس کے بعد دیگر شہروں میں بھی اسلامی حکومت قائم کی گئی۔ اور آپؐ ان شہروں میں اپنا نمائندہ بھیجا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت امیر المومنینؑ کے دورِ حکومت میں بھی ہر شہر میں ایک حاکم (گورنر) منصوب کیا جاتا تھا تا کہ وہاں کے سیاسی و اقتصادی معاملات اور حدود و تعزیراتی نظام چلایا جا سکے۔

اور یہ افراد اختیاراتِ تامہ رکھتے تھے۔ جیسے مصر پر قیسؓ ابن سعدؓ، محمدؒ ابن ابو بکر پھر مالک اشترؓ منصوب کئے گئے۔ دوسرے شہروں کا حال بھی یہی ہے۔

کیا ان افراد (نمائندگانِ رسولؐ و امیر المومنینؑ) کو ولایتِ تشریعی حاصل نہیں تھی؟ کیا ہر گورنر کو اپنے ماتحت شہر پر حکومت کرنے کا جواز حضرت رسولؐ اور امیر المومنینؑ کی جانب سے منصوب ہونے کی وجہ سے نہیں ملا تھا؟ آیا کسی گورنر نے ولایتِ تکوینی اور مقاماتِ معنویہ کا دعویٰ کیا؟

چنانچہ غیبتِ صغریٰ میں امام زمانہؑ کے چار نمائندوں کی ولایت نافذ اور واجب الاطاعۃ تھی۔ کیا کوئی شیعہ نوابِ اربعہ کی ولایت میں شک کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! آیا ان ذواتِ اربعہ نے کبھی مقامِ معنوی اور ولایتِ تکوینی کا دعویٰ کیا؟ ہرگز نہیں!

پس اگر یہی ولایت اور وجوبِ اطاعت زمانِ غیبتِ کبریٰ میں فقیہِ اہل بیتؑ یعنی جامع الشرائط مجتہد کے لئے ثابت ہو جائے تو کون سی مشکل سامنے آئے گی؟

مگر یہاں دو لحاظ سے فرق ہے۔ ایک یہ کہ ان نمائندوں اور نوابِ اربعہ کی ولایت، حضورِ معصوم کے زمانے میں ثابت تھی لیکن فقہاء کی ولایت ان کی غیبت میں۔ دوسرا فرق یہ کہ فقہاء کی ولایت کی دلیل اور ان کی تنصیب کا ثبوت ان کی صفات کے حوالے سے ہے جبکہ رسول اکرمؐ، امام علیؑ اور امام زمانہؑ کے نمائندوں (نوابِ اربعہ) کی ولایت نصِ خاص کے ذریعے ثابت ہے۔ مگر دونوں قسم کے نمائندے وظیفہ شرعی انجام دینے اور مسئولیت کے اعتبار سے برابر ہیں۔

ولایتِ تشریعی میں خلط

بعض فقہائے عظام نے ائمہ کے لئے تین قسم کی ولایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تیسری قسم "لوگوں کی جان و مال پر ولایت" ثابت ہے اور اس ولایت کے ثبوت میں کسی اختلاف کی نفی کرتے ہوئے دو مثالیں بھی ذکر کی ہیں:

۱۔ کسی شخص کی زوجہ کو طلاق دینا۔

۲۔ کسی کے املاک کو فروخت کرنا، یا خود امام کا اس پر تصرف کرنا۔

پھر یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ولایت روایاتِ متواترہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ غدیرخم کے خطبہ میں حضور اکرمؐ نے فرمایا:

"من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ...... الست اولیٰ بالمومنین من انفسھم قالوا بلیٰ"

"جس جس کا میں مولا ہوں علیؑ اس کا مولا ہے .... کیا میں مومنین پر ان کے اپنے نفسوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ سب نے کہا: ہاں (یارسول اللہؐ)"

فقیہ کی اطاعت، صرف تبلیغِ احکام (افتاء و بیان احکام) کی حدود میں اپنے مقلدین پر واجب ہے۔ لیکن لوگوں کی جان و مال کے متعلق شریعت میں کوئی ولایت ثابت نہیں ہے۔ مثلاً فقیہ کو یہ ولایت حاصل نہیں ہے کہ کسی کے مکان کو فروخت کردے یا کسی کی بیٹی کو کسی کے عقد میں دے دے۔ پھر ایک واقعہ بیان کیا ہے جو صاحبِ جواہر اور ان کے ایک معاصر فقیہ کے، جو ولایت مطلقہ کا قائل تھا، درمیان پیش آیا۔ صاحبِ جواہرؒ نے اپنے معاصر فقیہ سے کہا "زوجتک طالق" ۔ "تمہاری زوجہ طالق ہے۔" فقیہ معاصر نے جواب دیا "لو کنت متیقنا باجتھادک لاجتنبت من زوجتی" ۔ "یعنی اگر مجھے آپکے اجتہاد پر یقین ہوتا تو اپنی زوجہ سے اجتناب کرتا۔" (مصباح الفقاہۃ ۔ ج ۵ ۔ ص ۳۷، ۳۸)

جواب مذکورہ بحث قابلِ مناقشہ ہے۔ یہاں صرف بعض نکات کی طرف مختصر انداز میں اشارہ کیا جاتا ہے۔

✿ حضرت رسول اکرمؐ اور ائمہ اہل بیتؑ کو لوگوں کے مال و جان پر ولایت، شرعی موازین کے مطابق قطعاً ثابت ہے۔ یعنی کسی کے مکان کو فروخت کرنے اور کسی کی زوجہ کو طلاق دینے میں فردی یا اجتماعی مصلحت ہو۔ اور ولایتِ مطلقہ کے مطابق مذکورہ بالا ولایت، موازین

شرعیہ کے مطابق فقیہِ جامع الشرائط کو نیز حاصل ہے۔ چنانچہ فقیہ، بعض حالات میں کسی کی زوجہ کو شوہر کی اجازت کے بغیر طلاق دے سکتا ہے۔

اگر ائمہؑ کے لئے مذکورہ ولایت کسی مصلحت اور مناط و میزان کے بغیر ہو تو یہ ولایت محلِ کلام ہے۔ کیونکہ حضرت رسولؐ اور ائمہ اطہارؑ، شرعی حدود و احکام سے بالاتر نہیں ہیں۔ اور یہ حضرات دائرہ شرع سے تجاوز بھی نہیں کرتے۔ ان کی سیرتِ مطہرہ اور زندگی کا ہر ہر لمحہ اس بات کا ثبوت ہے۔

✿ ولایتِ فقیہ کو تبلیغِ احکام سے مخصوص اور دیگر اقسامِ ولایت کی نفی ایک مسلمہ مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دعویٰ ان فقہاء کی جانب سے کیا جاتا ہے جو نظریہ ولایتِ فقیہ کے پہلے معنی کے قائل اور اس کے دوسرے اور تیسرے معنی کے منکر ہیں۔[1] مگر وہ فقہاء، جو ولایتِ مطلقہ کے قائل ہیں، ہر اس ولایت کے قائل ہیں جو معاشرہ اور فرد کی زندگی کے سیاسی، اقتصادی، سماجی، تعلیمی معاملات کو چلانے کے لئے ضروری ہے۔

✿ صاحبِ جواہرؒ اور معاصر فقیہ کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی تنقیح طلب ہے۔ کیونکہ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ صاحبِ جواہرؒ کی جانب سے فقیہِ معاصر کی زوجہ کو طلاق دینا کس میزان و مناط اور مصلحت کے مطابق تھا؟ کچھ نہیں! ظاہراً صاحبِ جواہرؒ معاصر فقیہ کی زوجہ کو طلاق دینا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کی علمی صلاحیت کو آزمانا چاہتے تھے۔ واللہ العالم

دوسرا سبب: تاریخی ہے

جس دن سے، اسلامی حکومت اس کی اصلی سمت سے موڑا گیا اسی دن سے آہستہ آہستہ اسلامی نظامِ احکام، اور افکار میں انحراف پیدا ہونا شروع ہوگیا اسلامی حکومت سے پوری بشریت اور بطور خاص اسلامی معاشرہ یہ توقع رکھتی تھی کہ ان کے درمیان عدل و انصاف کا دور دورہ

[1] پہلے اور دوسرے معنی کی تفصیل کے لئے دیکھیں صفحہ 42۔

ہوگا کسی پر ظلم وستم نہ ہو، ہر ایک آرام و پرسکون زندگی گزارے اور معنوی و مادی میدانوں میں ترقی وتکامل کا سلسلہ جاری رہے۔ مگر ہوا کچھ اور عدل وانصاف کے بدلے فردی واجتماعی سطح پر جور وستم اور بربریت ودہشت گردی کا ایسا نمونہ پیش کیا گیا جس کی مثال تاریخ بشریت میں نہیں ملتی اس ظلم وستم کا سب سے پہلا نشانہ ائمہ اہل البیتؑ، پھر ان کے پیروکاروں کو بنایا گیا چنانچہ بنی امیہ اور بنی عباس پھر عہد خلافت عثمانیہ اس پر روشن گواہ ہے اس تاریک دور میں ائمہ اہل البیتؑ کا بنیادی کردار یہ رہا کہ مذہب حقہ کے تحفظ، عقائد، حقائق ونظریات وفروع دین کا بیان، اس کی تشریح اور شیعوں کی جان ومال کی حفاظت کے اسباب ومناسب ماحول فراہم کیا جا سکے اور حاکم وقت کے ساتھ تصادم کرنے کو اس وقت کے حالات، افراد اور فکری حوالوں سے زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔

ائمہ اہل بیتؑ کے بعد فقہائے امامیہ نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور عملی سیاست میں حصہ لئے بغیر علمی، فکری، تربیتی اور فرہنگی میدان میں خدمات سرانجام دیتے رہے پھر ایک مصیبت یہاں سے شروع ہوگئی کہ ظلم وستم کے ماحول میں پیدا شدہ حالات ''مجبوری حالت'' کو اصلی وطبیعی حالت میں تبدیل کیا گیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فقہاء کی ذمہ داری وہی ہے جو ائمہ اہل بیتؑ پھر علمائے اعلام، بنی امیہ اور بنی عباس کے تاریک دور میں انجام دیتے تھے حالانکہ مجبوری اور اضطراری حالت پر عام اور طبیعی حالت کا قیاس کرنا قطعاً خطا ہے، غیر طبیعی حالت پیدا ہونے کے کچھ اسباب ہوا کرتے ہیں یہ اسباب ختم یا نیم ختم ہونے کے بعد حالتِ سابقہ بھی بدل جاتی ہے جس کا حکم اور اس حالتِ طبیعی میں رہنے والے افراد کی ذمہ داری بھی قطعاً الگ ہوا کرتی ہے۔

سابقہ ادوار تاریخ ''تاریک دور'' میں ولایتِ فقیہ یا مستقل حکومت کا نظریہ زیر بحث لانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور کسی فقیہ نے یہ نہیں سوچا کہ موجودہ حکومت کے خاتمہ کے بعد کونسی حکومت ہوگی اور فقہاء کا کیا دور ہوگا؟ اس کے باوجود فقہائے عظام نے حسب ضرورت بعض فقہی مسائل میں نائب امام کی ضرورت کی شرط لگائی ہیں چنانچہ نماز جمعہ کی بحث میں فقہاء نے تحریر کیا ہے فقیہ جامع الشرائط، نائب امام ہے۔ حقوقِ شرعیہ میں تصرف اور اجرائے حدود وتعزیرات

بھی ان مسائل میں شمار ہوتے ہیں جہاں نیابت امام یعنی ولایت فقیہ کی ضرورت ہے۔

خلاصہ: ۱۔ظلم وستم کا دور ایک استثنائی دور تھا اور اس کا اپنا خاص حکم ہوتا ہے۔

۲۔حالت میں تبدیلی آنے کے بعد اسی کے احکام اور اس میں اپنائے گئے مواقف خود بخود بدل جاتے ہیں لہٰذا اس تبدیل شدہ حالت کو پہلے حالت جبر واستبداد پر قیاس کرنا قطعاً حکمِ عقل وشرع کے خلاف تصور کیا جائے گا۔

تیسرا سبب: اسلام کا ناقص تصور

اسلام کے بارے میں لوگوں کا تصور، ناقص اور حقیقت کے خلاف ہے۔فقہائے عظام کے متعلق بھی یہی بات درست ہے۔البتہ ہر دور میں بعض فقہاء اس بات سے مستثنیٰ ضرور ہیں، یعنی بہت سے فقہاء، اسلام کے متعلق ایک جامع وشمولی فکر کے حامل نہیں ہوتے، اور غیبتِ کبریٰ میں اسلامی نظام کے نفاذ کی ضرورت کا احساس اور اس میں فقہاء کی ذمہ داری کا ادراک بھی نہیں رکھتے اور اپنی ذمہ داری کو بیانِ احکام اور درس وتدریس میں محدود سمجھتے ہیں اور یہ کام ساری وجاری ہے لہٰذا ولایت فقیہ کے بارے میں سوچنا اور نظریہ قائم کرنا چہ معنی دارد؟

اگر اسلام کے بارے میں مذکورہ ناقص تصور بدل جائے اور اسلام کو ایک نظام حیات سمجھے، اس حقیقت کو درک کرے کہ اسلام میں فردی پہلو سے زیادہ اجتماعی پہلو پر توجہ دی گئی ہے اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ انسان کے تمام مسائل کا حل ہر زمان میں اس کے تقاضوں کے مطابق پیش کرے تو فقہِ سیاسیٔ اسلام میں نظریہ ولایت فقیہ کو وہ مقام ضرور ملتا جو اس کو ملنا چاہئے تھا۔اور یہ نتیجہ بھی اخذ کرنے میں کوئی تردید باقی نہیں رہ جاتی کہ نظریہ ولایتِ فقیہ کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کا منطقی حل ناممکن ہے۔

چوتھا سبب: روایت

بعض افراد کی جانب سے انکارِ ولایت کے بارے میں یہ شبہ پیش کیا گیا ہے کہ بعض

روایات میں بتایا گیا ہے کہ ''زمانِ غیبت میں کوئی جھنڈا، کسی بھی نام سے بلند کیا گیا تو وہ ناکام ہو گا۔''

جواب اول۔ پہلے سند روایت کا جائزہ لینا ہوگا۔

جواب دوم: اس روایت کے خلاف بھی کافی روایات پائی جاتی ہیں جو غیبت میں مسلمانوں اور فقہاء کی ذمہ داری بیان کرتی ہیں کہ اسلامی نظام نافذ کرنا ان کی مسئولیت اور ذمہ داریوں میں سے ایک ہے اور یہ کام تشکیل حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

جواب سوم:

روایت کا مضمون یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ زمان غیبت میں نیابت خاصہ کا دعوی کرے یا وجود امام زمانہؑ کی نفی کرے اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے تو یہ داعی ہرگز کامیاب نہیں ہوگا۔ انقلابِ اسلامی ایران کے بانی امام خمینیؒ نے علمِ اسلام بلند کیا اور مسلمانوں کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی دعوت دی مگر مذکورہ طریقے سے کبھی دعوت نہیں دی اور نہ نیابت خاصہ کا دعوی کیا اور نہ رؤیت امام کا، بلکہ امام خمینیؒ نے اسلام کا علم زمان غیبت میں ظلم وستم کے خلاف بلند کیا اور ہر قدم پر امام زمانہؑ کے اسم گرامی کو ورد زبان کرتے ہوئے آگے بڑھے دراصل ظہور امامؑ کے لئے زمینہ سازی کا عمل انجام دیا ہے۔ چنانچہ ظہور امامؑ کی صورت میں امام خمینیؒ کے پاس جو کچھ تھا وہ امام زمانہؑ کے سپرد کرنے کو تیار تھا اب بتاؤ (اے اشکال تراش) اس قیام کی مذمت کس معیار اور منطق کے مطابق ہوسکتی ہے؟

جواب چہارم:

انقلابِ اسلامی کی کامیابی دلیل بطلان روایت:

روایتِ مذکورہ میں تشکیک کے لئے انقلابِ اسلامی ایران کی کامیابی کافی ہے۔ اگر غیبت میں کوئی علم یا دعوت کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی تو دعوت امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی کیسے کامیاب ہوا اور تقریباً تیس سال سے نہ صرف اپنے پاوں پر کھڑا ہے بلکہ اپنے اندرونی دشمنوں کا

منہ کالا کرتے ہوئے عالمی استکبار کو ہر میدان میں شکست فاش سے دوچار کردیا ہے۔

جواب پنجم:

روایت سے منظور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ زمانِ غیبت میں قیام کرنے والا کامیاب نہیں ہوگا بلکہ قتل یا شہید کیا جائے گا یعنی اس شخص کے قتل اور قیام سے پیشگی خبر دینا مراد ہو۔ اس میں نہ کوئی مذمت ہے نہ راہِ خدا میں شہید ہونا کوئی عیب ہے۔ کیونکہ کسی بھی شخص کا اپنے دینی فریضہ کو انجام دیتے ہوئے جان دینا قابلِ تمجید وتحسین ہے نہ تقبیح وتوہین۔ چنانچہ بزرگانِ دین کی سیرت یہی رہی ہے کہ اپنے موقف کے انجام سے باخبر ہونے کے باوجود جہاد ومقابلہ جاری رکھا مثلاً حضرت امیر المومنینؑ معاویہ سے مقابلہ وجنگ کرنے میں ہر قسم کی کوشش کی اور اصحاب کو جنگ کرنے کے احکامات مسلسل جاری کرتے رہے۔ درحالیکہ امیر المومنینؑ کو علم تھا کہ معاویہ آپؑ کی شہادت کے بعد تک زندہ رہے گا اور اسلامی مملکت پر قابض ہوگا۔

"أَمَا إِنَّهُ سَيَظْهَرُ عَلَيْكُمْ بَعْدِي رَجُلٌ رَحْبُ الْبُلْعُومِ مُنْدَحِقُ الْبَطْنِ، يَأْكُلُ مَايَجِدُ، وَيَطْلُبُ مَالَا يَجِدُ ..."

"میرے بعد جلد ہی تم پر ایک ایسا شخص مسلط ہوگا جس کا حلق کشادہ اور پیٹ بڑا ہوگا، جو پائے گا نگل جائے گا اور جو نہ پائے گا اس کی اسے ڈھونڈ لگی رہے گی۔۔۔۔۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۵۷ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ)

اس طرح حضرت امام حسینؑ حکومت وقت کے خلاف جہاد ومقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے جب کہ آپؑ کو بھی یہ علم تھا کہ ستمگروں کے خاتمہ کئے بغیر اپنی شہادت واقع ہوگی۔ ان دو واقعات کے علاوہ اور بھی شواہد پائے جاتے ہیں کہ شہادت سے آگاہ ہونے کے باوجود مقابلہ اور مبارزہ سے دست بردار نہیں ہوئے۔ اس حقیقت کا فلسفہ یہ ہے کہ منکرات، بدعتوں اور ظالموں سے مقابلہ کرنا اور اسلامی نظام کی برقراری، اصلاحِ معاشرہ اور دعوتِ حق دینا ایک ایسا اسلامی فریضہ ہے جس کی ضرورت واہمیت کا انکار ناممکن ہے۔ لہٰذا اس فریضہ پر عمل کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرنا ہر

زندہ دل انسان کی آرزو ہوا کرتی ہے چنانچہ موت وشہادت سے خائف ہو کر میدانِ جہاد چھوڑ کر متاعِ دنیا سے لذت اٹھانے والے قابل مذمت ہیں۔

خلاصہ:

زمانِ غیبت میں قیام کرنے والوں کی موت وعدم کامیابی کی پیشگی خبر ہے نہ کہ ان کو اپنے فریضہ پر عمل کرنے سے روکنا ہے۔

جواب ششم:

زمانِ غیبت امامؑ میں راہِ حق اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی خاطر جہاد کرنا اور سیاسی وسماجی دعوت دینا ظلم وستم کے ازالے اور ظالم وجابر سے مقابلہ کرنا اور مظلوم کی نصرت اور اس کے پائمال شدہ حق کے استرداد "اسے پلٹا دینا" اور معاشرہ میں عدل وانصاف کے عام کرنے کی غرض سے کوشش کرنے کے جواز کی دلیل دیگر ائمہ کی سیرت طیبہ اور قولی وفعلی تائید سے مل جاتی ہے یعنی ائمہ اطہارؑ معاشرہ میں جہادی وسیاسی سطح پر حکومتِ وقت کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں میں سے بعض کی تائید کرتے تھے چنانچہ امام رضاؑ اور مامون عباسی کے درمیان زید بن علیؑ (امام زین العابدینؑ کے فرزند) کی قیادت میں رونما ہونے والی تحریک کے بارے میں گفتگو کتب تاریخ میں ثبت ہے جو بہترین اور واضح ترین دلائل میں شمار کی جاتی ہے؛ کہ امام معصومؑ کی شرکت یعنی براہِ راست قیادت کے بغیر مذکورہ بالا اہداف کی خاطر پاک سیرت اور حسنِ نیت کے ساتھ امام کی امامت کے قائل افراد کی جانب سے تحریک چلانا بالکل صحیح ہے۔ امام رضاؑ اور مامون کے درمیان ہونے والی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے جب زید کو گرفتار کر کے امام رضاؑ کے پاس لایا گیا اور مامون نے زید کو امام علی رضاؑ کے سپرد کر دیا اور آپؑ سے کہا:

> اے ابوالحسنؑ! آپ کے بھائی نے خروج کر کے جو کچھ کیا سو کیا۔ اس سے پہلے زید ابن علیؑ نے خروج کیا تھا اور وہ قتل ہو گئے تھے۔ اگر مجھے آپ کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کو قتل کر دیتا کیونکہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ کوئی

معمولی جرم نہیں ہے۔

اس پر امام رضاؑ نے فرمایا۔اے امیرالمومنین! آپ میرے بھائی کو زید بن علی بن حسینؑ کی طرح خیال نہ کیجیے،وہ آل محمدؐ کے علما میں سے تھے۔ ان کو اللہ کی راہ میں غصہ آیا اور انہوں نے اللہ کے دشمنوں سے جہاد کیا۔ یہاں تک کہ اس کی راہ میں قتل ہوئے۔مجھ سے میرے والد بزرگوار موسیٰ بن جعفرؑ نے بیان فرمایا کہ: میں اپنے والد بزرگوار جعفر بن محمد کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ میرے چچا زید پر رحمت نازل فرمائے۔ کیونکہ انہوں نے رضائے آل محمدؐ کی طرف دعوت دی اور اگر وہ فتح مند ہوجاتے تو اپنے وعدہ کو وفا کرتے۔انہوں نے مجھ سے اپنے خروج کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو میں نے کہا تھا: آپ کناسہ کے مقام پر قتل ہونا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے پھر جب وہ مغلوب ہوگئے تو امام جعفرؑ بن محمدؑ نے کہا: وائے ہو ہر اس شخص پر کہ جس نے ان کی پکار سنی ہو اور جواب نہ دیا ہو۔

اس پر مامون نے کہا: اے ابوالحسنؑ! کیا امامت کا غلط دعویٰ کرنے والے کے لئے وہی حکم نہیں ہے کہ جو ہے؟

امام علی رضاؑ نے فرمایا: زید بن علیؑ نے کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا جس کا ان کو حق نہیں تھا اور وہ ایسے معاملے میں اللہ کا بہت زیادہ خوف کرتے تھے کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ: ''میں لوگوں کو رضائے آلِ محمدؐ کی جانب دعوت دیتا ہوں'' اور بخدا زید ان لوگوں میں سے تھے جن کو اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے: وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ ھو اجتباکم ۔تم لوگ اللہ کے لئے ایسا جہاد کرو جو اس کا حق ہے،اس نے تم کو منتخب کرلیا

ہے۔(الحج۔آیت ۷۸)

(سیرت ائمہ اہلبیتؑ، جلد دوم، ص ۴۵۲، ۴۵۳۔ ہاشم معروف حسنی، اردو)

اس گفتگو میں چند نقاط قابل غور ہیں

(الف)۔لاتقس ۔۔ فانہ من علماء آل محمد۔ میرے بھائی زید اور زید ابن علیؑ "فرزند امام زین العابدینؑ" کے درمیان مقایسہ و مقابلہ نہیں ہے۔ حضرت امام زین العابدینؑ کا فرزند "زید" علمائے آل محمد میں سے ایک ہے اور اپنا دینی فریضہ کی تشخیص و ادراک کے مطابق قیام کیا اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا جو بالکل درست اقدام تھا اور اس نے معاشرے اور حکومتی سطح پر فسادات، منکرات، بدعتیں اور ظلم وستم کے بے انتہا وقائع و حالات دیکھ کر برائے خدا قیام کیا نہ کہ اپنے مفاد، شہرت اور حصول مقام کے لئے۔

(ب)۔زید بن علیؑ نے نہ امامت کا دعوی کیا نہ انکار، بلکہ اس دعوت و قیام کا مقصد حق دار کو اپنا حق لوٹانا اور اسلامی معاشرہ میں عدل و انصاف عام کرنا تھا۔

(ج)۔امام جعفر صادقؑ اس شخص کی مذمت کرتے ہیں جو زید بن علیؑ کی آوازِ دعوت سنے اور لبیک نہ کہے، امام کا یہ کلام مذکورہ تحریک کی تائید نہیں تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟

(د)۔آخر میں امام صادقؑ کے زید بن علیؑ کو مجاہد اور مذکورہ آیت کا مصداق قرار دینے سے اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ زید بن علیؑ صدقِ نیت، اخلاصِ عمل اور بلند مرتبہ کا حامل تھا۔

انقلابِ اسلامی ایران کے بانی، عصر حاضر کے زید بن علیؑ، اخلاصِ عمل اور للّٰہیت کے پیکر حضرت امام خمینیؒ ایک عالم بابصیرت اور ذمہ دار ہونے کی وجہ سے اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہوئے طاغوتِ زمان سے مقابلہ کیا اور کفرِ جہانی، استکبارِ عالمی اور سامراجیت کو للکارا اور ان کی آنکھوں میں آرام کی نیند کو حرام کر دیا اور شہنشاہیت کے ملبے پر اسلامی ریاست کی عمارت ولایتِ فقیہ کی بنیاد پر قائم کی (اور انشاءاللہ یہ حکومت ظہور امام تک قائم رہے گی) تو اس میں اشکال کہاں ہے؟

البتہ بعض افراد جو آرام طلب اور بیت المال سے خوب کھیلنے کے عادی تھے، انہیں

انقلابِ اسلامی، معاشرے میں تبدیلی اور ملت و مذہب کے پائمال شدہ حقوق کی بحالی ہرگز پسند نہیں ہے تاکہ ایک دن ان کے جمودِ فکری، خواب آور موقف اور عیش ونوش سے بھرپور زندگی موردِ سوال واقع نہ ہو۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے موقف کی صحت و درستگی کے اثبات کے لئے ہر خس وخاشاک کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضعیف سے ضعیف تر روایت اور شاذ سے شاذ تر قول کو مضبوط ترین عقلی ونقلی دلیل کے طور پر پیش کرنے کی سعیٔ لا حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بالمقابل عقلی، قرآنی اور تعلیمات اہل بیتؑ کی روشنی میں پائی جانے والی سینکڑوں دلائل وبراہین کو نظر انداز کرتے ہیں۔

پانچواں سبب: سیاسی ہے

انکارِ ولایتِ فقیہ کا ایک سبب سیاسی ہے۔ سیاسی مخالفین اسلامی جمہوری ایران کے اندر اور باہر دونوں سطح پر پائے جاتے ہیں چنانچہ اس قسم کے مخالفین میں اسلام دشمن اور تشیع دشمن طاقتیں بھی شامل ہیں۔

چھٹا سبب: فقدان دلیل

ولایتِ فقیہ مطلقہ کے منکر فقہاء، محض استدلال اور فقہی بحث کے دائرہ میں انکار کرتے ہیں یعنی ان کا کہنا ہے کہ ولایت مطلقہ کے انکار کی بنیاد فقدان دلیل ہے چنانچہ اجتہادی اختلاف کی نوعیت ہمیشہ فقدان دلیل یا وجدان دلیل پر قائم ہوتی ہے مگر اس نظریہ کے قائلین کہتے ہیں کہ اس کے ثبوت پر عقل ونقل اور قرآن وسنتِ معصومینؑ دونوں کے مطابق ادلہ موجود ہیں۔

❂ ملت ❂

مدارک

۱۔قرآن کریم
۲۔نہج البلاغہ
۳۔الکافی
۴۔اساس الحکومۃ الاسلامیہ
۵۔الحیاۃ
۶۔الحکم فی الاسلام
۷۔انتظار امام
۸۔تاریخ الغیبت الکبریٰ
۹۔شناخت اسلام
۱۰۔نہضت ہائے اسلامی در اسلام
۱۱۔خلافۃ الانسان وشہادۃ الانبیاء
۱۲۔قیادۃ العلماء
۱۳۔معنویت تشیع
۱۴۔جمہوری اسلامی
۱۵۔الامامۃ فی التشریح الاسلامی
۱۶۔مجلّہ التوحید
۱۷۔محاضرۃ فی ولایتِ الفقیہ
۱۸۔الاسلام واوضاعنا السیاسیۃ
۱۹۔مجلّہ الفجر

مدارک (ضمیمہ جات)

۱۔الجواہر۔محمد حسن نجفی
۲۔النہایۃ۔شیخ طوسی
۳۔شرائع الاسلام۔محقق حلی
۴۔شہید اسلام۔مولف
۵۔متاہات فی مدینۃ الضباب۔گروہ علماء
۶۔ولایت ودیانت۔مہدوی ہادوی تہرانی
۷۔مکاسب۔شیخ اعظم انصاری
۸۔کتاب نقد شمارہ چہارم۔گروہ علماء
۹۔مقدمہ ابن خلدون۔ابن خلدون
۱۰۔الٰہیات ج ۳۔جعفر سبحانی
۱۱۔ولایت فقیہ۔منتظری
۱۲۔الدولۃ الامویہ۔محمد الخضری بک
۱۳۔الہجرۃ العاملیۃ۔جعفر المہاجر
۱۴۔مصباح الفقاہۃ۔توحیدی

اغلاط نامہ

نمبر شمار	اغلاط	صحیح	صفحہ نمبر	سطر نمبر
۱	لواحیه	یواجه	150	10
۲	حسین	حین	150	11
۳	۳۶۵	۳۶۶	154	11
۴	کے نتیجے سے	کی چکی میں	164	8
۵	حاکم اعلی، حاکم	حاکم اعلی ایک فقیہ	164	12
۶	مصر	الجزائر	168	9
۷	مصری	ظالم	168	10
۸	انّ	وبانّ	186	5
۹	الامام	الاقامة	186	5
۱۰	نائب اور پوری	نائب یا پوری	186	12
۱۱	عموم الولایةالفقیه	عموم ولایةالفقیه	188	1
۱۲	؟نظرے	؟نظریئے	188	20
۱۳	نصب	نسب	191	8
۱۴	رسورمؑ	رسول اکرمؐ	192	3

صفحہ نمبر 185 قول محقق کا حوالہ (الجواہر۔ج ۲۱۔ص ۳۹۶) بھی ہے۔

صفحہ نمبر 186 صاحب جواہر کی عبارت کا تتمہ یہ ہے "وعلى التقديرين بثبوت النيابة لهم في كثير من المواضع على وجه يظهر منه عدم الفرق بين مناصب الامام اجمع...."

صفحہ نمبر 186 صاحب جواہر کی عبارت کا حوالہ (الجواہر۔ج ۲۱۔ص ۳۹۶) بھی ہے۔

یادداشت